زیر سرپرستی عالیجناب مولوی سید افسر حسین صاحب [illegible]

نظارہ لکھنو

۱۹۳۱ء

از ادیب شہیر

ابوالمحسن سید ظفر عباس فضل لکھنوی

نظارۂ لکھنؤ

سالگرہ نمبر

اسسٹنٹ ایڈیٹر ۔ بہزاد ذاخری لکھنوی

جلد ۲ | بابت ستمبر و اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء | نمبر ۴ و ۵



محضورات

نگار اور معارف کی جنگ

نگار کی مخالفت اب عام ہوتی جاتی ہے۔ بقول مدیر اشارات (سرفراز) اب لوگوں کی آنکھیں کھلیں۔ عبدالماجد صاحب دریا آبادی تو پہلے ہی سے مخالفت کا طوفان اٹھا رہے تھے اور معارف کے عالم عرصہ سے روشنی ڈالنے میں مصروف تھے۔ مگر اب تعمیر نے بھی ہمت آزمائی شروع کر دی اور زمیندار کے خرمن میں بھی چند دانے نظر آنے لگے۔ معارف اور نگار میں عرصہ سے چھیڑ چھاڑ جاری ہے۔ اول الذکر کے ادارہ سے اسوۂ صحابیات شائع کی گئی تھی سنا ہے کہ مدیر نگار نے لفظوں کی الٹ پھیر سے اسوۃ الصحابیات کو صرف صحابیات کر کے اپنا لیا۔ اور اسی میدان سے جنگ چھڑ گئی

نگار و مذہب ان دونوں ناموں میں ربط پیدا ہو سکتا ہے ورنہ عبدالماجد دریا آبادی سے کٹر مسلمان نیاز سے صلح کر سکتے ہیں۔ نیاز بھی ہر تعاون سے بے نیاز ہیں لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ نگار کے مضامین کا جواب دینے میں معارف پیش قدمی کرتا ہے مگر جواب میں تکمیل ندارد ہے۔ لوگوں نے مدت سے بدنام کر رکھا ہے کہ نظارہ کا وجود بھی نگار ہی کے مقابلے کے لئے ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ مذہبی و اخلاقی محافظت سب پر لازم ہے لیکن نظارہ نگار کے مقالوں پر ایسی بے معنی قلم فرسائی نہیں کرنا چاہتا۔ جسکو دوسری لفظوں میں ڈھمٹ بندی کہا جا سکے۔

مطالعہ حدیث تحقیق کی روشنی میں یہ مسلسل مضمون نگار میں شائع ہو رہا ہے۔ جس نے سب تو سب نمازوں کو غائب کر کے مسلمانوں پر پنجوقتہ احسان کیا ہے لیکن اس کے مقالہ اول ہی کا جواب دیا گیا جس میں حضرت ابوہریرہ پہ لے دے کی گئی ہے۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ معارف و اسکے اہل قلم نماز سے زیادہ حضرت ابوہریرہ کی روک تھام فرض جانتے ہیں نگار کے مقالہ نویس نے جا بجا لغزش و تاویل کی ہے مگر معارف بھی ہر جگہ شہ زور ثابت نہیں ہوتا۔ معارف کی تمہید میں جس لہجہ سے فریاد کی گئی ہے وہ بھی قاتل کے لئے صرف ایک رجسٹری شدہ رسید ہو سکتی ہے۔ معارف کے مقالہ نگار کہتے ہیں " اس سے پہلے کے مقالات میں غریب پرانے مولوی، مجددین ملت ہدف ملامت بنتے تھے لیکن تازہ مقالہ میں بہ داد اصلاح نے آج سے تیرہ سو سال پیچھے جا کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے خلاف مورچہ جمایا ہے۔

سطور بالا سے شان جواب کا پتہ لگا لینا آسان ہے ایک طرف یہ تفضیلِ قارئین کے جذبات قدسیہ سے اپیل کر رہی ہیں اور دوسری طرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی ذاتیات سے مقالہ نگار مرعوب کرنا چاہتا ہے ہماری بھی یہی دعا ہے کہ خداوند عالم صحابہ کرام کو رضوان عطا فرمائے لیکن صحابی اگر وہی ہیں جنھوں نے غیر مشروط طریقہ سے حیات میں آنحضرت کو دیکھا ہو تو فہرست صحابہ اس سعی و کوشش پر بھی نا تمام ہے اور اس گروہ میں اچھے برے دونوں کا وجود بدیہی ہے۔ اور قرآن مجید خود ناطق ہے کہ بعض ایسے لوگ جنھوں نے آنحضرت کو خود دیکھا ہی تھا ایسے بھی جنکو آنحضرت ان کے بشرے اور رنگی اداؤں سے پہچانتے تھے وہ سب عنوان کے علاوہ کسی اور جگہ بھی ہیں و لو نشاء لاریناکھم فلعرفتھم بسیماھم

ولتعرفنهم فی لحن القول واللہ یعلم اعمالکم (سورۂ محمد) صرف صحابیت سے مرعوب کرتا اور جمے ہوئے اعتقادات سے اپیل کرتا تو یہ جہالی حقیقت سے عدول ہے۔ اصحاب میں منافق بھی تھے اصحاب ہی میں مرتد بھی ہوئے۔ اصحاب ہی میں سے کچھ کافر بھی تھے اسلئے نگار کا یہ طرز عمل صحیح ہی کہا جاسکتا ہے کہ صحابہ جو واجب التعظیم ہو سکتے ہیں ان کے مقام سے علیحدہ کرے اور یہ جرح و تعدیل ہی سے ممکن ہے۔ اس تحقیق و تدقیق میں اور حدیثی مصادر کی اند سب سے پہلے جو ذات قابل گرفت تھی وہ حضرت ابوہریرہؓ ہی ہو سکتے ہیں۔ بقول بیانیہ واقعہ ہے کہ روایت کی حیثیت سے یہ ابو الاسر ... اقامتی اور اس میں شک نہیں کی روایتوں کی عمر سے مزید خوش صورت اختیار کر لی۔

نگار کے مقالہ نگار نے حقیقتاً مضمون کو انہی دو حصوں پر تقسیم کیا ہے جو جواب مقالہ نگار معارف پہلے حصہ میں حضرت ابوہریرہ کو تاریخی اور اخلاقی حیثیت سے گرانے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں انکی روایتوں پر عاقلانہ تنقید کی ہے۔

ہمارے خیال یہ دونوں حصے متوازن تھے پہلے حصہ میں تحقیق کی گئی ہے کہ اس کثیر روایات کا راوی کتنے دن آنحضرت کی خدمت میں رہا تھا تاکہ وقت و وسعت معلومات کا اندازہ لگایا جاسکے۔ دوسرا حصہ وہی ہے جس کو دوسرے لفظوں میں درایت کہا جاتا ہے درایت اگر گناہ ہے

تو ایں گناہ ہست کہ در شہر شما نیز کنند

مقالہ نگار معارف جواب کو تاخیر و تعویق کے جال میں الجھاتا ہے اور اسکو یہ درد سر شروع ہو جاتا ہے کہ مقالہ نویس نگار اپنا نام ظاہر کرنے میں کیوں لرزتا ہے، مان لیجئے کہ آپ ہی کے خوف سے لرزتا ہو اور حق گوئی کے پردہ میں خوفزدہ ہی سہی لیکن مقالہ نگار معارف کیلئے جواب دینے میں اس سے کیا موانع پیدا ہوتے ہیں۔

اصل اعتراض یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ وہ آنحضرت کی خدمت میں کمسنی میں آئے اور صرف تین چار برس ہی فیض صحبت حاصل کر سکے۔ مگر کثرت حدیث میں ان سے بھی بازی لے گئے جو اول دن سے آخر دن تک ہمراہ تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں

میں پلا ہوا یتیمی کی حالت میں اور جب آنحضرت کے پاس ہجرت کی اس وقت میں مسکین تھا اور نوکر تھا غزوان کی بیٹی کا صرف پیٹ کی نوکری پر اور باری باری اونٹ چرانے پر جن لوگوں کے لئے کہ ایک خیمہ تھا جب وہ اترتے اور جانوروں کو ہانکا کر چلاتا جب وہ سوار ہوتے تو شکر ہے اوس کا جس نے دین کو مضبوط کیا اور ابوہریرہ کو دین کا پیشوا بنایا۔ (ابن ماجہ) آخر کے فقرے قابل غور ہیں (نگار) مقالہ نگار معارف نے اس حصہ کے بھی کئی حصے کئے ہیں اور پہلے اعتراض (۱) جب (ابوہریرہ) مدینہ گئے تو یتیم و مفلوک تھے اس اعتراض کا جو کچھ جواب دیا گیا ہے وہ سب ان لفظوں میں سما جاتا ہے (۱) ابوہریرہ سن یتیمی میں نہ آئے تھے بلکہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں (۲) کوئی کمسن بچہ مذہب کی تلاش میں دور دراز کا سفر نہیں کر سکتا اور یہ اصول فطرت ہے)

ناظرین ان دونوں جوابوں کے کچے پن سے ناواقف نہیں رہے۔ پہلے حصہ کا جو جواب دیا گیا ہے وہ حضرت ابوہریرہ کی حمایت نہیں کرتا۔ بلکہ شیفتگی کو اور بھی خطرناک بنا رہا ہے اور صاف بتا رہا ہے کہ آپ جب اتنی سی بات کہنا چاہتے تھے کہ اوسکا شکر جس نے دین کو مضبوط کیا اور ابوہریرہ کو دین کا پیشوا بنایا تو اسکو زور ولادت سے مع تفصیلات شروع کر دیتے تھے آپکی یہ فطرت رواۃ کے لئے باعث مصیبت بھی ہوگی اسلئے کہ آپکو تو صرف تقریباً زمانی مقصود ہوتی تھی اور ناقلین اس ساری تقریر کو ہر ہر جملہ کو جوں جوں کر حدیثیں ڈھالتے جاتے تھے۔ جملہ دہ بسیار گوید دروغ۔

(۲) جواب کا دوسرا حصہ اگر خود نیازی کی جانب سے پیش ہوتا تو لائق قبول بھی تھا، مگر کسی ایسے ایماندار پر جو حدیث و رواۃ کی حاجت فرض سے بالاتر جانتا ہو۔ وہ اصول فطرت پیش نہیں کرسکتا کہ بچہ مصیبت خیز و طویل سفر صرف مذہب کیلئے نہیں کرسکتا درانحالیکہ ایسے بچے بکثرت ہیں جنھوں نے صرف ایمان کیلئے ہزاروں مصیبتیں جھیلیں بلکہ جانیں دیدیں حضرت ابوہریرہؓ نے بھی اگر بچپن ہی میں یہ سفر کیا ہو اور زحمات سفر کو برداشت کر گئے ہوں تو صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ سخت جانوں کی قسم کے تھے۔ (باقی آیندہ)

جان عالم نمبر۔ نظارہ نے سوا برس جن مشکلات میں مبتلا رہکر بسر کیا وہ قارئین کرام سے مخفی نہیں ہے۔ گر نظارہ کے کارکنوں نے ہمت مردانہ سے کام لیا اور دشواریوں کا مقابلہ ہنسی خوشی کر کے نظارہ کی زندگی باقی رکھی۔

نظارہ کا نقطۂ نظر جتنا بلند تھا اتنا ہی ضروری بھی اوس نے چاہا تھا کہ وہ ادبیات کی اس کمی کو پورا کرے جو تعصبات کی چھریوں سے کاٹ کاٹ کر علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

ہندوستان کے ادبیات میں شیعان ہندوستان کا جو درجہ امتیازی ہے وہ پس حجاب کھا گیا ہے۔ ہندوستان اور اُردو زبان پر جو حقوق ان کو دیا جارہا ہے انکے تذکرے اول تو لئے ہی نہیں جاتے اور اگر کئے جاتے ہیں تو حقوق برادرانہ کو فراموش کر کے چنانچہ شاہان عادلیہ سلاطین بہمنیہ و قطبیہ و عادیہ و سلاطین اودھ و ناظمان بنگالہ وغیرہ وغیرہ میں اکثر ہم ہی میں سے تھے اور انکے نیم صدی حالات ہمیں درحریت میں سبق آموز بھی ہیں مگر قوم جب خود فراموشی کے مرض میں مبتلا ہو تو غیر کیوں جگائیں۔

اس کمی کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے شاہان اودھ سے شروع کرنے کا قصد ہے اور ان مالی دقتوں کو دیکھتے ہوئے بھی جان عالم نمبر کو سلطان عالم واجد علی شاہ مرحوم کے سچے حالات سے مخصوص کرنیکا ارادہ ہے والله الموفق وھو المعین

جس خیال کے پیش نظر رکھتے ہوئے ہمنے کلکتہ کے صعوبات سفر برداشت کئے وہ صرف واجد علی شاہ نمبر کے لئے تصاویر و حالات کی فراہمی کا خیال تھا۔ گذشتہ نمبر میں لکھا جاچکا ہے کہ حضرات شہزادگان کلکتہ نے نظارہ کا نہایت مسرت سے استقبال کیا اور اس کے ساتھ امداد بھی فرمائی۔ امداد کے لئے جن جن حضرات نے وعدہ فرمائے تھے سب نے قریب قریب اپنے اپنے وعدہ وفا بھی کردیے لیکن تصاویر میں صرف دو تصویریں اور دو حالات موصول ہوئے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس مخصوص نمبر کو جلد از جلد شایع کردیں مگر تصاویر اور حالات نہ ہونے سے ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں جس طرح کہ شاہزادگان نے عزت بخشی اسی طرح اسکی بھی اُمید ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے تصاویر و حالات روانہ فرمادینگے۔ ہمیں اسکا بھی سخت افسوس ہے کہ ہم سب حضرات کی خدمت میں حاضر نہو سکے جن جن شاہزادگان یا کرشد زادگان کے یہاں ہم نہیں پہونچ سکے ان سے معافی چاہتے ہیں اور تصویر یا حالات کی خواہش کرتے ہیں لیکن اگر وہ اس طرح متوجہ نہونگے تو مجبوراً ہمکو پھر کلکتہ حاضر ہونا پڑیگا۔

نظارہ حیدرآباد میں نظارہ کی رسائی میں بھی روزانہ اضافہ ہے یہ سنکر ہمدردان نظارہ خوش ہونگے کہ نظارہ حیدرآباد کے بھی بڑے دربار دل میں جا پہونچا۔ اور سب سے زائد عالی جناب نواب میر ممکن الدین حسین خانصاحب بہادر خلف نواب خانخانان نظام یار جنگ سابق

وزیر عسکر نظام دام اقبالہم اور عالی جناب نواب حسام الدولہ شوکت جنگ بہادر دام اقبالہ نے ہماری عزت افزائی فرمائی اور نظارہ کی امداد کے لئے وعدہ فرما لیا ہے۔

میری شدید علالت ۱۲ اکتوبر کو میں رامپور نظارہ کی توسیع اشاعت کے لئے گیا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ اسٹیشن پر قدم آتے ہی شدید بخار میں مبتلا ہو جانا پڑے گا۔ اہل رامپور خصوصاً مولوی عابد علی صاحب قبلہ پشیمان نے جس طرح دن بھر میری تیمارداری کی شاید اپنے مکان پر بھی مجھے اتنی آسائش مشکل سے پہونچ سکتی تھی۔ مرض لمحوں میں ترقی کر رہا تھا اور چند گھنٹے گذرنے کے بعد استفراغ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مجھے مجبوراً شام کی گاڑی سے لکھنؤ واپس ہونا پڑا۔ صبح ۶ بجے لکھنؤ پہونچا۔ یہاں پہنچا مرض نے اور ترقی کی اور ۱۴ اکتوبر کی رات جس طرح مجھ پر گذری ہے شاید عمر بھر میں اس رات کی تکلیف کو فراموش نہیں کر سکتا۔ میرے ہوش و حواس ختم ہو چکے تھے۔ بیہوشی کا عالم تھا۔ میں کسی اپنے دوست یا عزیز کو پہچاننے سے مجبور رہتا۔ بخار ایک سو سات ڈگری تک پہونچ گیا تھا۔ دس بجے شب سے تین بجے شب تک اٹھارہ سیر برف میرے سر پر رکھی گئی۔ استفراغ کا سلسلہ چار روز تک سیکڑوں کی تعداد میں بڑھتا رہا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ غذا کی نلی میں تین زخم پڑ گئے جس سے روزانہ خون آتا تھا اور بخار کے جانے کے بعد سترہ روز تک کسی قسم کی غذا نہ ہو سکی۔ اگر میں دودھ یا پانی کا بھی ایک گھونٹ پی لیتا تھا تو گھنٹوں زخموں کی اذیت سے کروٹیں بدلنا پڑتی تھیں۔ الحمد للہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ نہ تو اب بخار موجود ہے اور نہ متلی کی شکایت ہے۔ لیکن تین زخموں میں سے دو مندمل ہو چکے ہیں صرف ایک زخم ابھی باقی ہے۔ خدا جانے وہ زخم بھی کب تک باقی رہے۔ میں سب سے پہلے ناظرین نظارہ سے پرچہ کی تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔ اسکے بعد اسکا افسوس کرتا ہوں کہ اس پرچہ میں نہ تو ترتیب مضامین صحیح ہے نہ میں کاپیوں کی صحت کر سکا نہ مضامین پر نظر ڈال سکا نہ پروف دیکھ سکا غرض جس طرح بھی ہو سکا یہ رسالہ پیش کش ناظرین ہے

میں ان سب حضرات کا شکر گذار ہوں۔ جنھوں نے میری عیادت کی غرض سے زحمت تشریف آوری گوارا کی اس میں خصوصیت سے قبلہ و کعبہ مولانا سید سبط حسین صاحب مجتہد، نواب مولوی السید افسر حسین صاحب بی اے (سرپرست نظارہ) منشی پیارے لال صاحب صولت۔ مرزا محمد حسین صاحب۔ تابش صاحب۔ ہوش صاحب۔ نازش صاحب۔ میکش صاحب۔ بہزاد صاحب۔ منظر صاحب۔ اختر صاحب۔ معجز صاحب۔ بشاش صاحب کے اسمائے گرامی قابل تذکرہ ہیں۔

آخر میں اپنے محترم دوست اور شہر کے ہردلعزیز ڈاکٹر مسٹر بیجناتھ صاحب ورما۔ ایم۔ بی۔ بی ایس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنھوں نے بغیر کسی معاوضہ کے میرا علاج کیا اور اس طرح کہ دن میں اکثر ایسا ہوا کہ دو دو مرتبہ تشریف لائے ورنہ ایک مرتبہ تو ضرور آتے تھے۔ اور پھر اپنے ضروری کام کو نظرانداز کر کے میرے پاس گھنٹہ گھنٹہ بھر بیٹھنا دوا وغیرہ اپنے ہاتھ سے پلانا۔ یہ سب ایسی چیزیں تھیں جس کے بعد میں نے بھی اپنے اعزہ سے کہدیا تھا کہ موت اور زندگی دست قدرت میں ہے۔ لیکن اگر میں بدحواس ہو جاؤں تو میرا علاج نہ بدلا جائے۔ بہرحال اب صرف ضعف اور تھوڑا سا مرض باقی ہے — خداوند عالم سے امید ہے کہ جس نے اتنا مرض کھویا وہ اتنا بھی دور کر دے گا۔

فضل　۱۵ نومبر ۱۹۳۱ء

رامپور کی ترقیات

(ایک اتفاق کار کے قلم سے)

بعہد معدلت مہد حضور پر نور فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ امیر الامرا مخلص الدولہ
لفٹننٹ ہز ہائنس عالیجاہ نواب السید رضا علی خان صاحب بہادر مستعد جنگ
فرمانروائے دار السرور رامپور دام اقبالہم و ملکہم

رامپور اے مصطفےٰ آباد اے دار السرور
تیرے ذرے ذرے میں اسلام کا پنہاں ہی نور

تجھ میں ہی جاہ علیؑ شان محمدؐ کا ظہور
تو ہی مینی تال کے دامن میں جیسے شمع طور

مسلم آبادی تری بسنے کو آئی دور سے
سلسلہ مخفی ہمالہ کا ہے کوہ طور سے

تیری عزت تیغ تھی ہمت تھی تیرا افتخار
جوہر مردانگی بازو سے تیرے آشکار

اتنا تیری تیغ کا پانی بڑھا سیلاب دار
ایک حد تھی سنگ و گنگ اک حد کٹھار و ہردوار

جوش ہمت تیرا دیرہ دون سے کب دور تھا
شاہد عینی ہی منصوری کہ تو منصور تھا

سید و افغان و شیخ آباد تھے تجھ میں بہم
الغرض جو تھا جوانمرد و سپاہی ذی حشم

اپنے نوابوں کا تو سینہ سپر ثابت قدم
کیونکہ مالک سے وفا یہ ہی سپاہی کا دھرم

مثل رحمت خاں نہ پھیرا منھ کبھی تلوار سے
باڑھ کو تلوار کے کاٹا لہو کے دھار سے

رامپور سے جو عہدِ نوابِ فیض میں سے عیاں | تھا سعیدی عہد تیرا یا سعادت نشاں
تھی شرافت جسکو غلامی جو اب کہاں | تعزیہ دارِ حسینؑ احمد علی خاں حکمراں

جب تھے کنعاں میں یوسف حاکم و مختار تھا
شہر کا ایک ایک کوچہ مصر کا بازار تھا

غدر میں طرزِ عمل تیرا حکیمانہ رہا | اُف وہ آندھی شہر جسکے بعد ویرانہ رہا
شمعِ دہلی گل ہوئی ساقی نہ پیمانہ رہا | میکشانِ لکھنؤ باقی نہ میخانہ رہا

تھے وہ غافل جو یہ سمجھے خود سے شیشے لڑ گئے
ہاں لیکن ہوشیاروں کے دلوں میں پڑ گئے

غدر میں انگریز تھے در حالتِ امید و بیم | آگرہ کا رنگ بیٹھ سب حالِ دہلی کا سقیم
کی مددِ برٹش کی تو نے تھے وہ مہماں تو کریم | غرق کوٹھی میں ہوا جمنا کا سیلابِ عظیم

غنچۂ سربستۂ امید تیرا کھل گیا
اس صلے میں بیش قیمت اک علاقہ مل گیا

یاد ہو وہ عہد جب کلب علیخاں تھے امیر | لکھنؤ کا خاتمہ دہلی کی تھیں سانسیں اخیر
حضرت تھے صاحبانِ فن نہ تھا جنکا نظیر | رامپور اس وقت ان سب کا تو ہی تھا دستگیر

اے تا نواب قسمت جو لگی پھوٹی ہوئی
جوہری نے بیچ لی پھر سا گر لوٹی ہوئی

واہ وہ مجلس کہ جسکا صدر ہو خود نکتہ داں | زیبِ مجلس غالبِ آزاد گو شیوہ بیاں
داغ کی شستہ زباں اور انکی ہستی داستاں | ناسخ شرعِ ادب بزمِ سخن کا پہلواں

مالکِ ملکِ معانی جلوۂ معقول امیر
میر منشی اور وہ استادِ کل پیر گو اسیر

واقف رمز زباں نقاد بے شبہ و مثال — بحر و تسلیم و خلیل و اصغر و رشک و جلال
جان و غمگین و حیا شاداں غنی سایا کمال — بلبل نغمہ سرا یعنی منیر خوش مقال
گرد اہل علم و فن تھے صدر مجلس شاہ تھا
بلبلوں میں پھول بزم اختری میں ماہ تھا

عہد مشتاق علی خاں تھا اگرچہ مختصر — پھر بھی تھا جوش سخا سے تیرا دامن پر گہر
عہد شاہ جم حشم حامد علیخاں نامور — تیرے چپے چپے پر جسکا نمایاں ہے اثر
مقصد تدبیر منزل صحت افکار دیکھ
قلعۂ نو دیکھ پختہ شہر کے بازار دیکھ

یہ مصفا شاہراہیں اور یہ برقی روشنی — ہاں کہیں اہل بصارت ہو یہ کیسی روشنی
سر میں تنویر عدالت دل میں دینی روشنی — گھر سے لیکر قبر تک ہو روشنی ہی روشنی
یہ شرف پایا علیؑ کے پاس تربت بن گئی
عاقبت در نجف چشم بصیرت بن گئی

شکر ہے آغاز عہد نو کا شاہانہ ہوا — آگیا عہد الرضا جشن ملوکانہ ہوا
عہد بیداری میں ذکر خواب افسانہ ہوا — دست ساقی پر نیا لبریز پیمانہ ہوا
عہد عہد ارتقا ہے سن بھی رعنائی کا ہے
توڑ لے تارے فلک کے قصد انگڑائی کا ہے

اے چمن والو نسیم خیر آگئی پھر چلی — ہو مبارک شجرۂ شاہی کی یہ کھلتی کلی
نام ہی سے شان شاہی و ترقی ہے جلی — ہیں حکومت میں رضا اور الوہیت میں علی
آجکل ہو جد و کد و نام رضا کی شان میں
مصطفےٰ آباد کی حد میں ہو یا ایران میں

جس طرح ہی آج حسن انتظام ایسا نہ تھا — کوچہ کوچہ یوں صفائی ہو کبھی دیکھا نہ تھا
چوکیداری راتکو اور دن کو یوں پہرہ نہ تھا — گاؤں گاؤں اس طرح تعلیم کا چرچا نہ تھا

بہر مرضی مستعد یوں چارہ گر کس روز تھے
ہاں شفاخانوں میں اتنے ڈاکٹر کس دور تھے

بارہ لاکھ اکروز میں بخششے سخاوت دیکھئے — آٹھ گھنٹے کام خود کرتے ہیں ہمت دیکھئے
سال بھر کے فیصلے گنئے عدالت دیکھئے — بیلی پر لیگئے خود فوج جرات دیکھئے

آپ تقریریں کیں سردارونکو جب یکجا کیا
خود بنایا نقشۂ جنگ اور خود دھاوا کیا

دیکھ تو اے رامپور انکی طرف اپنی طرف — فیض سے انکے نگینے بنگئے تیرے خذف
ہاں وفاداری دکھا او ریاد کر طرز سلف — چاند تھے اسلاف تیرے تو نہ بن جا اکلف

ہاں تعاون کر تو دونا نور ہو بازار میں
شرط ملجا نا ہی برقی روشنی کے تار میں

ہوگئی فوجی ترقی انکی جب مشہور عام — قیصر ہندوستاں نے سنکے حسن انتظام
حد شاہی تھی جو منصوری دہم بھیجا پیام — عہدۂ فوجی دیا انکو باعزاز تمام

مصرعۂ تاریخ نکلا یہ مسیحی سال سے
پایا اکلیل خطاب لفٹننٹ اقبال سے
۱۹۳۱ء

ہندی جذبات کے عنوان سے مولانا بدت اجتہادی کی نظم جولائی، اگست، کے "نظارہ" مین شایع ہوئی ہو اُسکے پانچویں شعر میں کاتب نے غلطی سے "اک" لکھدیا ہے "ایک" ہونا چاہیئے۔ اور آٹھویں شعر کے پہلے مصرع میں "دن" کے بعد "رات" لکھنے سے رہگئی ہے "دن رات" ہونا چاہیئے۔ ناظرین تصیح کرلیں۔

نشتر

ناز نیاز اگرچہ نگاہ غلط انداز سے بھی بے نیاز ہی۔ مگر جب مخالفت کا ہجوم ہوتا ہی اُسوقت سرکاری انداز سے ایک دو شایع کی جاتی ہی اور بس ۔ ۔ ۔ نیاز صاحب کی مخالفت کچھ مسلمانوں میں اب عام ہوگئی ہی۔ چنانچہ ندوۃ العلماء کے نیم پختہ علما و طلبا میں آپ کے تجدد کو بدعت سے بھی کچھ بڑا سمجھا گیا اور عام طلبا کو مشورہ دیا گیا کہ وہ نگار کی لفظی رنگینیوں سے فریب نظر میں مبتلا نہوں۔ نگار کی مخالفت میں نظارہ تو بدنام ہی تھا مگر اب ہمت، ’’سچ‘‘ ’’زمیندار‘‘ وغیرہ بھی زور لگا رہے ہیں۔ ’’معارف‘‘ ’’ادبی دنیا‘‘ سے تو پرانی دشمنی ہی۔ لیکن نیاز پارٹی بھی مخالفین کی کثرت سے ناواقف نہیں ہی۔ اسی بناء پر چند تازہ مددگاروں نے عدم کے رخنوں سے لحد کی طرف جھانکنا شروع کر دیا ہی۔

میر بکائی کے خالق مرزا ہنسوڑ کے لباس میں تائید کرینگے۔ نیاز صاحب نے سرکاری طور سے شایع کر دیا ہی کہ وہ پکے مسلمان ہیں اور اپنی ذات کے سوا ایسی پختگی انکی جستجو، کاوش و تلاش پر بھی کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔ سیاح کی ڈائری کی اشاعت کے بعد بھی ایک ایسا ہی اعلان ہوا تھا کہ میں متعصب نہیں ہوں۔ ’’سچ‘‘ گویان لکھنؤ کے جواب میں بھی ایسا ہی کچھ کہا گیا تھا کہ ذاتیات سے مجھے مطلب نہیں ہی۔ نقد و تبصرہ محبوب فن ہی۔ اسمیں شک نہیں کہ بعض انسان بدقسمت ہوتے ہیں اور اُن پہ الزام لگانے میں دنیا کو خواہ مخواہ لطف آتا ہی۔

ایک شریف آدمی کے یہاں ایک بدقسمت نوکر آگیا تھا۔ یہ نوکر تازہ جوان تھا۔ اسکی صورت پر غریبی برستی تھی۔ وضع دریدہ پدر کے بارے سب کا دشمن تھا تھا۔ البتہ راستے میں کبھی کبھی قوت ہمت و زبان کی آزمائش ضرور کرتا تھا اور فرصت کے وقت اسکو تفریح کی سوجھتی تھی۔

مثلاً ایک دن اسکے سامنے سے ایک حلوائی خوانچہ میں مٹھائی لگائے خستہ سال کراری پٹی کی آواز دیتا نکلا۔ اس نوجوان ملازم نے کچھ بھی شرارت نہ کی البتہ خوانچے والے کی پشت کی طرف سے ذرا سا سہارا دیدیا۔ یہ شاید تنبیہا ہو کہ خوانچہ کو ایک ہاتھ سے تھامے رہنا چاہیے۔ اب خوانچہ اگر سر سے گر پڑا اور مٹھائی زمین پر پھیل گئی تو اسکا کیا گناہ مگر تلخ فہم شیرینی فروش نے میاں جی سے آکر شکایت کر ہی دی۔ حضور (حضور) آپکا نوکر بڑا شریر ہے۔ سب مٹھائی گرادی۔ میاں جی نے بلا کر پوچھا تو ملازم صاحب نے آنکھیں نیچی کئے تعبیر فرما دیا کہ میاں یہ جھوٹا ہی۔ میں اسی وقت میں نماز جمعہ پڑھنے گیا تھا۔ ۔ ۔ کون کہتا کہ یہ واقعہ منگل کا تھا لیکن اگر کوئی کہتا تو شاید ملازم جواب دیدیتا کہ حضرت ادھر سے ہولی آئی ہے منگل کے دن نماز جمعہ میں نے تو صرف پڑھی ہی اور بعضوں نے تو پڑھائی بھی ہی

دوسرے روز میاں جی کا پڑوسی بنیا روتا چلا آتا ہی۔ میاں جی نے پوچھا آخر کیا ماجرا ہی۔ اس نے کہا آپکے نوکر نے ناک میں دم کر دیا ہی اول تو گھر کی دہلیز مفت میں بے کرایہ قبضہ کر رکھا ہی۔ دوسرے وہیں کھانا بھی کھاتے ہیں اور بچا ہوا دال سالن بھی پھینک دیتے ہیں۔ ہم ہندو دھرم ہیں۔ ان سب پر طرہ یہ کہ بیٹھے بیٹھے دیوار کی استرکاری ادھیڑ دی۔ چونا غائب ہو گیا۔ اینٹیں نکل آئیں۔ میاں جی نے نوکر کو بلا کر پوچھا۔ اُسنے آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر کہا جھوٹ بالکل غلط میں اپنے دروازے سے باہر نکلتا ہی نہیں۔ پھر آجکل ماہ رمضان ہی۔ دن بھر روزہ رکھتا ہوں

رات کو مسجد میں روزہ کھولتا ہوں۔ آپکے یہاں سالن ضرور بچتا ہی مگر رات کو جو کھا کر بچتا ہی وہ صبح تک بلیاں لیجاتی ہونگی۔ مگر مجھے تو صرف دال ملتی ہی دبھلا ہڈیاں میرے پاس کہاں سے آئیں۔

تیسرے روز میاں جی کا دھوبی روتا ہوا آیا جمعرات کے نوکر نے آنا دوڑایا کہ پیٹ میں سالن نہیں سماتی۔ آخر کیا ہوا۔ میاں جی نے پوچھا اوس نے کہا حضور غریب کا گدھا ٹیلے پر چر رہا تھا۔ جمعرات کے نوکر نے اسکی دم میں مٹی کے تیل کا پیپا باندھکر لکڑی سے بجایا تو بیچارہ سمجھیں کہ گدھا لڑکر وہ سمجھا کہ جرمنی کی فوجیں آگئیں۔ اب جو بھاگتا ہی تو جمعرات تین میل بھاگتا چلا گیا۔ ابھی ابھی پکڑ کر لایا ہوں۔ میاں جی نے نوکر سے پوچھا اُسنے آنکھیں لڑا کر کہا سراسر جھوٹ۔ آپ ہی فرمائیے جسوقت کا یہ قصہ بیان کرتا ہی اُس وقت آپ ہی نے مٹی کے تیل کا پیپا دیکر کہا تھا کہ چار بوتلیں تیل کی لے آؤ۔ میں بھلا یہاں کہاں تھا۔

چوتھے روز گلی میں تلاطم تھا۔ سارا محلہ جمع تھا۔ دہائی ہی میاں جی کی۔ میاں جی گھبرا کر باہر آئے دیکھا سارا محلہ جمع ہی پوچھا آخر کیا ماجرا ہی ایک بولا۔ جناب آپکے نوکر نے میرے کتے کی دم اور پاؤں اور گلے میں پٹاخے کی لڑیاں باندھکر آگ لگا دی میرا کتا جل گیا۔ دوسرا بولا (تانگہ والا) میاں جی صبح صبح میں تانگہ جوت کر جو راہ پر کیا تھا۔ ابھی کچھ کمایا دھایا بھی نہیں تھا میں (دودھ والے کی دوکان پر حلیم پی رہا تھا) گلی میں سے کتا بھاگتا ہوا آیا گھوڑے کی ٹانگوں میں گھس گیا گھوڑا پٹاخوں کی آواز سے گھبرا کر تانگے کو لیکر بھاگا۔ ایک لڑکے کو چوٹ آئی۔ ایک بڑھیا کچل کر جاں بحق تسلیم ہوئی اور خود گھوڑا اور تانگہ الی یومنا ہذا غائب ہی۔ تیسرے نے کہا (دودھ والا) میاں جی میری تو دوکان تمام ہوگئی کتا گھبرا کر میری دوکان میں گھس رہا تھا۔ مگر خیر دوکان کے اندر تو نہ پہونچ سکا البتہ دوکان کے آگے جو سودا لگا ہوا تھا بالائی کے تھال۔ دہی کا کونڈا دودھ کا گھڑا وہ سب نہری کی نذر ہوا جو بچا تھا بڑھا رستنے لگا۔ یہ درزی تھا۔ اُس نے کہا میاں جی میں تو لٹ گیا میرا بیڑا ہی، دیکھیے اور گاہک نے جوتوں کا نرف دیکھئے میں تو آنکھ نیچی کئے سی رہا تھا کہ ناگاہ کتا سنگر مشین کے نیچے سے ہوتا ہوا دوکان میں گھس گیا۔ دوکان میں آگ لگ گئی اچکن شیروانی غرض

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میاں جی نے ملازم کو بلا کر پوچھا اُس نے بے جھجک جواب دیا۔ آپکو معلوم ہی کہ میں کتے سے کسقدر ڈرتا ہوں رات کو کتے بولتے ہیں۔ تو میں زمین پر لیٹ کر پلنگ کو اوپر سے اوڑھ لیتا ہوں پھر بھلا میں کتے کو کیونکر پکڑ سکتا تھا۔ اور پٹاخے کیونکر باندھ سکتا تھا۔ دوسرے کتا نجس ہی اور میں مسلمان تیسرے میرے پاس پٹاخے خریدنے کیلئے رقم کہاں سے آئی۔ آپنے صبح کو گھی لانے کو جو روپیہ دیا تھا وہ گر گیا تھا۔ بھلا میں اسکو ڈھونڈھتا یا کتے کے پٹاخے باندھتا۔ لہذا بالکل جھوٹ۔ (۲) تانگے والے کا الزام بھی فضول ہی۔ گھوڑے کا کام دوڑنا ہی۔ ذرا پوچھ لیجئے کہ آج ہی گھوڑا دوڑا یا کل بھی دوڑا تھا۔ لہذا الزام غلط جھوٹ موت زندگی پر کسی کا کیا اجارہ۔ بڑھیا کی یونہی لکھی تھی۔ سچ کہا ہے جو بدا ہی ادا ہوگا۔ (۳) دودھ والا سچا ہے مگر اس میں میرا کیا قصور۔ جسوقت میں نہری میں روپیہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ اوسوقت میں نے بھی دیکھا تھا کہ پانی کی جگہ دودھ بہہ رہا ہی۔ بلکہ میں خیریت پوچھنے بھی گیا۔ (۴) درزی کی کمزوری سے کتے نے فائدہ اٹھایا۔ ورنہ دودھ والے کی طرح یہ بھی باہر ہی باہر روک سکتا تھا۔ اصل میں میں بدقسمت

ہوں لوگوں کو مجھ غریب پر الزام لگاتے ہوئے مزا آتا ہے۔

میاں جی نے آخر بقیہ تنخواہ حوالے کی اور کہا کہ شہر بھر جھوٹا ہے اور تم اکیلے سچے ہو لہذا سچوں میں جا بسو۔

نیاز صاحب بھی کچھ ایسے ہی بدقسمت ہیں۔ لوگ زبردستی الزام لگاتے ہیں۔ انکو بھی سچوں کی تلاش کرنا چاہیئے اور الفتنۃ اشد من القتل پر نگاہ رکھنا چاہیئے اسلیئے کہ آپکو دعویٰ ہے کہ آپ مولویوں سے اخلاق میں بہتر ہیں۔

(۲)

مغربی لچکدار دوشیزائیں۔ اب آزادی کے معراج الکمال پر جا پہنچی ہیں۔ کلکتہ کے اخبار ایڈوانس میں ایک طویل مضمون اس عنوان پر شایع ہوا ہے جسکا خلاصہ ہم قارئین کرام کے ملاحظہ کیلئے پیش کرنا اپنا فریضہ جانتے ہیں اسلیئے کہ ہندوستان میں ایسے دماغ بھی ہیں جو یورپ کی تقلید پر ایمان لا چکے ہیں۔ جو آزادی نسوان کے اس حدتک قائل ہیں کہ پردہ کا پردہ بھی باقی رکھنا پسند نہیں کرتے۔ یورپ میں نقاب اٹھجانے سے کیسی آزادی حاصل ہے وہ اخبار ایڈوانس کی زبان سے سنیئے اور چٹخارا لگائیے۔

دوشیزگان لندن نے نکاح متعہ تو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اور اب صرف رفاقت سے کام چل رہا ہے۔ ایک دوشیزہ ہفدہ سالہ ڈاکٹر سے دریافت کرتی ہے اور جب ڈاکٹر شادی کا ذکر چھیڑتا ہے تو زبیٰ کلابو بے جھجک فرماتی ہیں کہ بیاہ کا ان بکھیڑوں سے آزاد ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ لڑکے کی پرورش میں انکو تنہا تکلیف ہوگی تو دوشیزہ کی والدہ اپنے خدمات بخوشی پیش کرتی ہیں۔ دوسری لڑکی سے جب کسے بچے اور شادی کا سوال ہوتا ہے تو وہ ہنسکر کہتی ہے کہ میں نے نہایت خوبصورت اور پیارا پیارا بچا جنا ہے مضمون نگار آگے چلکر لکھتا ہے کہ مشرقی لندن کی لڑکیوں کا نقطۂ خیال بدل گیا ہے وہ ان تمام مسائل پر جو اسکی ذات سے وابستہ ہوں کھلم کھلا گفتگو کرتی ہیں اس بارہ میں تقدس و پاکیزگی پردہ داری کی پرواہ نہیں کرتیں "نہ وہ اپنے جسم کو جب شرم ٹھہراتی ہیں۔ نہ اس کے قدرتی استعمال کو غیر واجب گناہ خیال کرتی ہیں۔ یہ باتیں ایک پشت پہلے کی عورتوں کے لئے حیرتناک ہیں ہم نہیں جانتے کہ بس اعلیٰ تہذیب و کمال آزادی کا جاہے ملک (ہندوستان) میں کبتک رواج ہوگا اسلیئے کہ اخبار و رسائل جو ملک کی زبان بھی ہیں انھوں نے اندھا دھند تقلید کی ٹھان لی ہے۔ بعض زنانہ رسائل میں ولائتی معلومات کا ایک مخصوص باب ہمیشہ رہتا ہے اور عام رسائل ایسے ہی خیالات کو پھیلاتے ہیں۔

دراصل لیکن اب یورپ بھی ان آزادی کی رنگین تصویروں کی عریانیوں سے عاجز ہے۔ اور اگر اسکے بس میں ہوتا تو وہ ان سب کو کسی کالی ہوس میں بھیجدیتا۔ مگر اسکو پتہ نہیں ہے کہ ان مخموران شباب "حسن فروش نازنینوں کے لئے کوئی آسائش کی جگہ موجود ہے۔ شاید موجودہ آزادی کے ساتھ کوئی ملک بھی ان سفید ہاؤس کیلئے جگہ نہیں دیسکتا۔ مگر ہم سے پوچھا جائے تو ہم ایسی جگہ بتا سکتے ہیں۔ جہاں یہ لیلایان آزادی آرام سے رہ سکتی ہیں اور یاران نجد کے ساتھ حسن فروشی بھی کرسکتی ہیں اور یہ جگہ نیاز صاحب کی تخلیق جنت ہے۔

دنیا کے نزدیک حسن فروشی چاہے گناہ عظیم ہو۔ مگر صرف نیاز صاحب کی شریعت جمال نواز میں اسکو ثواب کہا جائیگا۔ اسلیئے کہ جناب موصوف آزادی کے غیر مشروط حامی ہیں اور مساوات عامہ کے سب سے بڑے داعی۔ دلیل روشن ہے۔ یعنی ان دوشیزگان لندن کا جسم خود انکی ملکیت ہے۔ لہذا طریق

استعمال میں انھیں کا انتخاب بھی صحیح ہو۔ اپنی چیز کا ہر شخص مختار ہو جاتا ہے حفاظت سے رکھے چاہے ۰۰۰۰ کے آگے ڈالدے۔

ہاں ذرا سا تامل ہو وہ یہ کہ ہندو دھرم اور اسلام دونوں کے نزدیک بدعت یہ بدعت حسنہ ہوگی یا نہیں تو ہمارا خیال ہے کہ آخر الذکر (اسلام) کی طرف سے مطمئن رہنا چاہئے اسلئے کہ نگار کے دفتر نے مسائل یورپ و دین اسلام کے تطابق کا ٹھیکہ لے لیا ہے فوراً صورت جواز پیدا کر دیجائیگی۔

مدتوں چمکا کیا سایہ در و دیوار کا

(از جناب ناظر لکھنوی)

غول ابل کر رک گیا رگ رگ میں قلب زار کا
خوف کھا کر تم تو منھ دیکھا کئے تلوار کا

بوجھ کاندھوں پر پڑا مر کر نہ جسم زار کا
تن سبک ہوتا گیا ایسا ترے بیمار کا

مجھسے بولا جب نظر کی اس نے سوئے ماہتاب
اتنا اونچا ہے سفید اک پھول میرے ہار کا

اللہ اللہ عندلیب اوج و رفعت کا وقار
جس کو کہتے ہیں فلک وہ صحن ہے گلزار کا

آپ نے پھر ہر دف دست تاسف کیوں ملے
رنگ مہندی کی طرح بدلا کیا سو قار کا

چھٹ گیا زندان تو یوسف سے مگر اللہ رے حسن
مدتوں چمکا کیا سایا در و دیوار کا

کچھ ہم کہیں کچھ وہ سمجھیں

اخلاق ایک ایسی چیز ہے جو انسانی خلقت اور اربعۂ عناصر کا پانچواں جز کہا جا سکتا ہے۔ اور یہی ایک تنہا چیز ایسی کہی جا سکتی ہے جو دشمن کے لقب کو بدل کر درست کر دے۔ آج سے چند روز قبل جب دوراز حال آپ حرارت کی گرما گرم کوٹھری میں بند تھے۔ تو ہم روز آپ کی عیادت کرتے تھے اور دن دن بھر آپ کے پاس بیٹھکر تیمارداری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ آج جس وقت ہم پر بھی یہی بلا نازل ہوئی اور ہم صاحب فراش ہو گئے تو آپ نے منہ پھیر کر صاحب سلامت سے بھی گریز کی لوگ کہتے ہیں۔ سلام خدا کا ہوتا ہے۔ مگر آپ اس سے بھی بے نیاز ہیں شاید یہ آپکو معلوم نہیں۔ اگر میں ملک الموت کے پنجہ میں دب چکا تھا تو آپ کے پوچھ لینے سے اچھا نہیں ہو جاتا اور اگر میری موت نہیں تھی تو آپ کے نہ پوچھنے سے میں مر نہیں گیا۔ مگر شاید آپ اس مطلع کو بھول گئے۔

فلک دیتا ہے جن کو عیش اُنکو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں



آپ سے کس کمبخت نے کہا تھا کہ آپ بھی شاعری کے میدان میں طرارے بھر لے۔ جبکہ آپ پہلا مصرعہ پہلے نظم کرتے ہوں اور دوسرا ابد کو۔ اور اگر کوئی حرف گر جاتا ہو تو آپ جھٹ سے فرما دیتے ہوں کہ جی کاغذ پر موجود ہے کہاں گرا۔ ہماری دعا ہے کہ ایسے شاعر جلد شاعری کی مصیبت سے نجات پا جائیں۔



بھلا ایک پونڈ مکھن کی کیا قیمت ہو سکتی ہے اور وہ کس ڈائری میں مل سکتا ہے ہم نے تو خدا نکردہ آپ سے جھوٹوں بھی نہیں کہا تھا کہ اجی حضرت آپ ہمارے لئے ایسی مصیبت گوارا کیجئے آپ نے خود ہی فرمایا کہ یہ مکھن جو آپ اتنی سخت علالت میں استعمال کر رہے ہیں بہت خراب ہے میں اپنے گاؤں سے تازہ مکھن لاؤنگا اور اگر گاؤں پر کسی وجہ سے نہ بھی دستیاب ہو سکا تو میرے مکان کے سامنے مکھن کی ڈائری ہے وہاں سے دو چار پونڈ حاضر خدمت کر دونگا۔ مجھ کمبخت بیمار سے اتنی خطا ضرور ہوئی کہ اس مکھن کی نقد قیمت کیوں نہ حاضر کی لوگ ایک مثل کہتے ہیں "حکیم بھی گئے کھانسی بھی گئی" بس اُسدن سے آپ ایسا غائب ہوئے جیسے نگار کی چار دیواری سے اسلام" جناب گر مکھن دستیاب نہ ہو سکا ہو تو خدا کا واسطہ اپنی کھدر پوش صورت دکھا دیجئے۔ کیا آپ ایسے ہی سچے وعدوں سے ہندوستانیوں کو آزادی کا منظر دکھا دیجئے گا۔؟

جوش سے خطاب

(لقا بدار سبز پوش کے قلم سے)

اے سراپا جوش اے ناواقف انجام کار — آستیں الٹو مگر پہلے ہو فوجوں کا شمار
ہاتھ میں لاٹھی نہیں اور ہے بوں پہ یہ پکار — لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار

ہمکو چھوڑو ہمتو ہیں نا اہل لفاظ سلف
تم عمل والے ہو کیوں رٹتے ہو الفاظ سلف

مردہ دل ہمکو کہو غافل کہو بودا کہو — سننے کو تیار ہیں۔ ہاں ہاں کہو۔ اچھا کہو
بات آپس کی ہے کچھ جھگڑا نہیں اپنا کہو — کوئی آمر سے۔ عمل کو گر کہے تو کیا کہو

دست نازک کو تمھارے تاب ہے کب جھپٹ کی
جھک کے دیکھو تو خلع ہے آستین میں کوٹ کی

وزن سے اترا ہوا نگیں نگینہ کچھ نہیں — لڑنے کو تیار دل جائے قرینہ کچھ نہیں
ہم تو عذر کرتے ہیں ضد ہی تم سے کینہ کچھ نہیں — شیروانی دھری ہے اندر سے سینہ کچھ نہیں

کتنی ہیں ابھری رگیں ہے پست دورہ خون کا
رانیں ہیں دُبلی بہت دھوکا ہے کٹ پتلون کا

اس میں کوئی شک نہیں اے ناصر شاہ حسین — میں ہوں مجرم سرزنش میرے لئے ہے فرض عین
ہاں میں ہی ہوں رائج غم باعث شور و شین — بائع حب علی و تاجر خون حسین

میں ہوں بد لیکن کچھ اچھے بھی ہیں یہ تسلیم کر
اس خصوصی خانہ جنگی میں نہ تو تعمیم کر

یہ سمجھ لے نص ہے یہ ہے قتل سے فتنہ اشد　　　بد تو میں ہوں تو قیاساً غیر کو کہتا ہے بد
پھر ہے دعوے کی حقیقت اعتقادی بے سند　　　علم سے خالی ہو تو گمراہ کن ہے جد و کد

علم مذہب مولوی یا ماسٹر کا حق نہیں
جو ہو خالی اسٹڈی سے اوس بشر کا حق نہیں

جس سے ناواقف ہے کیوں اس جا پہ رکھتا ہے قدم　　　تیرے ہمسایوں نے بیڑا کی ہیں شہرت کی ہم
نوح پیغمبر تھے تیرے کر تو نہ بیڑا ایک دم　　　بحر مذہب کیا ہے گنڈی پیٹ[1] کے ساگر سے کم

دور ہٹ کر بھر لے چلو اپنے پینے کے لئے
راستہ ہے موج ہاں لیکن سفینے کے لئے

ہاں منادی کر دو معطی آج سے توبہ کرے　　　کوئی ذاکر اب سونے کے ورق پیدا کرے
قیمتاً جنت ملے چپکے سے تو سودا کرے　　　خون ہی کبریت احمر ہو تو کوئی کیا کرے

آپکی کیا رائے ہے خانہ بدوشی سیکھ لیں
ہم تجارت چھوڑ دیں خفیہ فروشی سیکھ لیں

لوگ سرمایہ سمیٹیں حق کی دولت بیچ کر　　　خون چوسیں ڈاکٹر اپنی طبابت بیچ کر
شاعری حکمت ہے ہاں بیں جوش حکمت بیچ کر　　　شاید بیرسٹر رہیں نام عدالت بیچ کر

فیس کیسی یاں تو صدقہ ہے علیؑ کے نام کا
آپ مجرم ہیں کہ میں مجرم حقوق عام کا

اس گنہ پر صرف لعنت ہے کہ ہم ہیں مولوی　　　آؤ ممبر پر اگر تقریر کے ہو مدعی
ہم بھی تو دیکھیں کہ تم میں سے نکلتا ہے کوئی　　　تم تو لفظی مست ہو کاذب ہے یہ وہ مفتری

مشرقی گر بے نہیں مغرب ہی کا نالہ سہی
گر سر تال نہ بچ نہیں سکتا ہے اکتالہ سہی

---

[1] حیدرآباد میں ایک محلہ کا نام ہے

بے گرے ہو دیکھو تو سر بھی کوئی سرگم میں ہے | علم تو پنچم میں ہے لیکن عمل مدھم میں ہے

مبتدی ہو جستجو محدود زیر و بم میں ہے | ہم نہ لے توڑینگے جبتک دم ہمارے دم میں ہے

عہد الہامی سے یاں گونجی ہوئی آواز ہے

جنبش بال ملک ہے یا نوائے ساز ہے

غم نہیں ہم کو تجارت تو ہماری ہے مجاز | خون اور تقریر میں کسدن ہوا ہے ساز و باز

کھول کر دیکھو اگر گھر میں کہیں ہو جانماز | سجدہ گہ کی خاک میں ہے خون سردار حجاز

سجدہ گہ بکتی ہے یہ خود شاہ کے دربار میں

میرے مفتی ہے کوئی فتویٰ تری سرکار میں

جوش محبوب احباب ہے ترا حسن کلام | تیرے مجموعے میں چھپتے ہیں رباعی اور سلام

اہل ایمان لیتے ہیں اسکو ادا کرتے ہیں دام | جوش کیا ہم بھی کہیں یہ منفعت بھی ہے حرام

مانتا ہوں میرا اتنکا قابل تعزیر ہے

اسکو بھی دیکھا یہ کس کی آنکھ کا شہتیر ہے

جوش جن لفظوں میں کرتے ہو تعارف ہے یہ عار | اُف یہ مستی اور یہ بیہوشی یہ غفلت ہوشیار

یہ نہیں صدق و صفا ہے جرم خود یہ اشتہار | ہم سمجھتے ہیں ولی توبہ کو کر اپنا شعار

دوسروں کی ہمتیں بڑھ جائیں گی اعلان سے

پاک کر کے اس لب تر کو چھپا قرآن سے

شک ملک کا ہے عبث ذاکر بھی ہوتا ہے بشر | صاحب اہل و عیال و مبتلائے خیر و شر

پیٹ بھی ہے اک حقیقت گو نہ ہو تم کو خبر | پیٹ کو لازم ہے روٹی روٹی کو لازم ہے زر

ہم ذلیل و خوار پیشہ کے بھی غلہ خوار ہیں

آپکو گندم تو ہم کو بھی چنے درکار ہیں

کھلے بازار ہیں کھلی ہیں جاؤ مزدوری کرو — مجلسیں تبلیغ ہیں اپنا سے ملن کا کام ہو
سچ ہے لیکن کب نظر تفسیر اور قرآن پہ ہو — دیکھیں کب فلسفہ اصول و حکمت و تاریخ کو

انتہا شر پہ نہ ہو اک روز کار خیر کی
آپ سے کیا ذکر ستم ہو نکتہ چینی غیر کی

مہربان کوئی مشن قائم کیا ہو تو بتاؤ — نام پر تبلیغ کے اپنی کمائی سے دلاؤ
رات دن خدمت کریں ہم اپنے چپو تم لگاؤ — ناز ہے جس پر اکیلے کھے رہے ہیں ہم یہ ناؤ

چپ رہو یا کچھ مدد ہم کو پئے افلاح دو
ہم کریں تعمیر تم بیٹھے ہوئے اصلاح دو

مستحق داد تشنیع ہیں بس مولوی . . . — ہم ہیں گر کچھ تو صاحب زادہ ہیں ہو کے طلبی
غل ہو یہ اندھیر ہے روشن رہوں پر چوٹ کی — چاہیئے تو یہ کہیں گر - تو سے بھی آدمی

ہم نے تو اس وقت تک جو کچھ کیا جیسا کیا
ناصح مشفق بتاؤ تم کہ تم نے کیا کیا

ہم بھی خوش ہیں آج جی بھر کے ہوں باتیں کام کی — بارے تفہیم آپ نے کیا خدمت اسلام کی
چھوڑ کر کالج یہ دو فکریں تھیں صبح و شام کی — حسرتیں یا نوکری کی آرزو یا نام کی

ایک لکچرر ہو یا اندھوں کے ہیڈ رہو گئے
گر بہت اونچے گئے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے

شرح تقریرات تو لائے نہیں ہیں جبرئیل — روند کر قرآن بنے تم فوجداری میں وکیل
ڈاکٹر صاحب نے جاری کر دی وسکی کی سبیل — منہ تو دیکھو آئینے میں ہم کو کرتے ہو ذلیل

خدمت دینی کو پوچھو تو وہ کوسوں دور ہیں
ماسٹر صاحب فسانہ لکھنے میں مشہور ہیں

ماسٹر صاحب بنے دیہوش بی اے نیکنام ارض مشرق پہ بچھاتے پھرتے ہیں مغرب کا دام
ایسے متن سنگ یورپ یا گلٹ سازی کا کام انکا کہنا ہے فرض ہیو طاکی روٹی ہے حرام

تو حالات فرق لیکن دونو کا یکساں پیٹ ہو
اسوۂ احمد پہ اک ہو ناک میں - اے - بی ٹیٹ ہو

اس جہالت پر کہ جسے ہم نے کتابیں بار ہا ہوں وہ اچھی یا بری لیکن تخیل دین کا تھا
آپکے مضمون تکل دو اور دو بھی مرحبا مادہ اخبار کا طرز ادا اسرار کا

وقت ضایع آپنے جس میں کیا وزرات کا
وہ فن تصنیف فستر ہے جہالیات کا

ابھی اے تم میں ہوئی دو چار - ہاں اک شے بنے کچھ کلب کی بوتلوں میں چھپکے مچھے بنے
کچھ خلافت کے بھکاری کچھ تمکث کی جے بنے یعنی وحشیوں میں تم تین ذاکر کے بنے

دوستوں میں لال ہو اور دشمنوں میں زرد ہو
ہاں اٹھاؤ میری شمشیر بیان گر مرد ہو

آپکے کیا کی عرق ریزی زراعت کے لئے رہ گیا تقدیر کا سود اتجارت کے لئے
ہم کو فمائش تو فرمائی شجاعت کیلئے ہے اکھاڑہ بھی کوئی اظہار طاقت کے لئے

سستی کاہل بے عمل دونوں ہیں بے ہنگام کار
جوش حنین لافتی شوکت پکاریں دم مدار

ہم سے بہتر کور باطن عالم بازاروں میں ہیں آپ ہیں آئینہ دل پر نصیب یواروں میں ہیں
ہم کیا شیعہ ہیں مگر ہیں کو درباروں میں ہیں آپکے مجد کی فکریں ہیں روادارون میں ہیں

ہیں تو حق گو ساتے ہیں مگر انظار رہتے
دفتروں میں خاص مسلم شیعہ ہیں اخبار میں

دولتوں پر جو ہیں نازاں کیا وہ دیکھیں امر حق — عکس رہے آنکھ کے پردے میں اشکوں کا ورق

رنگ عینک کا ہے دھوکا ابر کو سمجھے شفق — غرق خون بیگنہ کس دن تھے چودہ طبق

مثل ذاکر اہل مجلس بھی ہیں ممنون حسینؑ

جسنے دعوت دی اسی کے گھر میں تھا خون حسینؑ

مجلسوں کے دعوتی رقعے یہ کیوں مختصر ہیں — پانوں جسپر ہیں یہ بستر خون کی چادر نہیں؟

تختۂ قبر حسینؑ ابن علیؑ ممبر ہیں — کیا یہ حصہ ہائے میت سرور نہیں

قوم شیعہ آپ کے نزدیک خون میں غرق ہے

گوشت خواروں اور خونخواروں میں کوئی فرق ہے؟

ہم ہیں اپنی ہی اگر اخلاص ہی مقصود عام — مرگئے شبیرؑ پیاسے کیوں پیو شربت کے جام

مجلسوں میں کیوں اڑیں حقے بھلے ہیں جب جام — ہر گلوری میں نمایاں سرخی خون امامؑ

طیش میں اپنی خبر تجھکو ستم پرور نہیں

ہاتھ ہے ذاکر کی گردن ہے - مگر خنجر نہیں

جو بڑے ہیں ہم سے ہے انکی جرأت کا یہ حال — دوڑتے ہیں گھوڑدوڑ تک مجلس میں تمنا ہے محال

نام سے مذہب کے غیروں میں ہو لرزاں بال بال — جاری چلمن ہے باہر گھر میں سلمان و بلال

اس طرف مجلس ادھر تھی پارٹی گلزار میں

دبگئی آواز ماتم شیشوں کی جھنکار میں

واہ رے میکش بہادر یہ شجاعت ہے اٹل — سرنگوں ہوں گھر میں باہر گھر کر دیں موچھوں پہ بل

ہم سے نوڑے اس شجاعت پر اگر کرتے عمل — رہگذر پہ ہے نکلتا نام سے شہ تو آج کل

خشک تر ہوتی نہ سرمست ہوائے یا حسینؑ

آ نہ سکتی دشت و در سے یوں صدائے یا حسینؑ

جابجا رونے ہی سے تاثیر گریہ ہو جلی   خلق جو پانی سے تھی دنیا وہ اشکوں سے پلی
ابتو یہ عالم ہو پتھر شق ہو یا چٹکے کلی   بے تقیہ صاف آتی ہیں صدائیں یا علیؑ

مس کو رزکر کے طلاسازی کو دائم کر دیا
اشک کے پارے کو نار غم پہ قائم کر دیا

رونے والے خانمان برباد تھے گھر بن گئے   دکھتی آنکھیں دیکھکر ہمدرد ڈاکٹر بن گئے
جانشاں آنسو تھے کہ خشک لب رگ تر بن گئے   دل میں چھالے بنگئے دامن میں گوہر بن گئے

خونفشاں کے پاس جو بیٹھا گلابی ہو گیا
یہ چڑھا اشکوں کا پانی چرخ آبی ہو گیا

آج سے کچھ روز پہلے قوم کا کیا تھا شمار   شہنواز و بیرم و طاہر یہی دو تین چار
آب شک خون سے آئی ایسی زراعت پہ بہار   ہو گئے وہ گل کرو رن جو نہ تھے پہلے ہزار

بودے تھے اسلاف لڑسکتے نہ تھے تلوار سے
دشمنوں کے قلعے ڈھائے آنسوؤں کی دھار سے

رنگ دیکے خون کا سینچا ہم نے گلزار وطن   چھوٹ تھا پانی مگر بھر بھر دیئے گل کے دہن
سبزہ پوشی کا فخر بدن تھا سنت کا چمن   پہلے بھی لالہ پہنتا تھا کبھی خونی کفن

رکھدی خود اپنی زبان اس نے ہا لغمہ سنج میں
باندھ دیں دلکی رنگین شاخیں بازار سنج میں

ایک جھنڈا ایکا یاں سونشان اجتہاد   چند جلسے آپ کے اپنا مکان اجتہاد
کس نے پھونکی ہے تن بیجا میں جان اجتہاد   ہے اذان کے ساتھ باقی خاندان اجتہاد

ناز ہو جس قوم پر وہ گم تھی جذب وصل سے
امتیازی حد بنائی ہم نے لفظ فصل سے

یہ نہ پوچھو تابہ کے رو رو کے رلائے جائینگے — دم ہر آہوں میں تو بادل کھینچ لائے جائینگے
ذکرِ قحطِ آب سے طوفاں اٹھائے جائینگے — تا وجودِ آب ہم موتی بنائے جائینگے

وہ اٹھا نیسانِ غم بادِ بہار آنے لگی
بھیگنے کا ڈر ہے تو ہٹ جا پھوار آنے لگی

چھوڑ ہمکو ہم تو ہیں سرمست تدبیرِ حسینؑ — دلمیں تصویرِ علیؑ آنکھوں میں تصویرِ حسینؑ
اُنکی جرأت اور تو، کھوتا ہے توقیرِ حسینؑ — دیکھتا ہوں کون چھو لیتا ہے شمشیرِ حسینؑ

چاہیے جرأت برائی اور بھلائی دیکھکر
شیر سے پنجہ لڑا اپنی کلائی دیکھکر

ہے عطا جائز تو پھر اُجرت مین کیوں تکرار ہے — اب یہ لفظی بحث ہے بیکار ہے بیگار ہے
مفت خوانی کی نہیں ہے کسنے کسکو عار ہے — ہان ضروری امتیازِ مفلس و زردار ہے

بس عطا سے قرب ہو اور جبر سے دوری رہے
وہ بھی اتنی کم کہ تھیٹر کی رقم پوری رہے

سال بھر میں سیکڑوں ہی مجلسیں ہیں بیش و کم — کیا ہر اک سے دام ملجاتے ہیں کھالو گے قسم
قوم نے جو کچھ دیا انعام یہ بھی ہے کرم — مدحِ اہلبیتؑ کیوں کرتے سمجھتے گر یہ ہم

عاقبت دنیا و دین دونوں سے کھوئے جائینگے
خونِ اہلبیتؑ میں لقمے ڈبوئے جائینگے

جوشؔ سچ کہتے ہو ہم زائد ہیں اور کم خفا یزید — شمر نے اک روز ہم نے دو پیسے کی ہے عید
خود کرو انصاف کسکا ظلم ہے ظلمِ شدید — ایک نے کشتہ کیا اک نے بہا خونِ شہید

کیا فقط رنگِ بیاں سے داستانین لال ہیں
خون سے شبیرؑ کی ابتک زبانیں لال ہیں

ہم مسلماں بھی نہیں، ہیں مگر سجدہ یکانشاں — جم گیا ہے خیمۂ اہل حرم کا یہ دھواں
اس رکوع بارسا پر تو نہ کر حسن گماں — ہمنے جھک کے پائے عابد میں بھری ہیں بیڑیاں

داغ پیشانی یہ ہے کیونکر چھپائیں جسم میں
چادر زینبؑ کی ہیں اب تک قبائیں جسم میں

نظم کی تاثیر سے بچھڑے ہوئے دل مل گئے — پھوٹ آپس کی گئی افراد کا دل مل گئے
جستجو سے جوش کی آخر یہ مشکل حل گئے — ہو مبارک قوم کو سرور کے قاتل مل گئے

معترف سنی و شیعہ تھے نہ اس تقصیر کے
اب کھلا ذاکر تھے قاتل حضرت شبیرؑ کے

اے بہادر اے جواں اے پر جگر ضیغم شکار — دعویٰ جرأت ہے تجھ کو کھینچ تیغ آبدار
سامنے ہیں شیعہ قاتل بچھ اوچھا ہو نہ وار — لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار

ہاں بڑہ اِن ورنہ وہ کہدینگے جنھیں کچھ ہوش ہے
نظم ساری ڈینگ ہے، جو کچھ ہے لفظی جوش ہے

تو بہادر ہے قوی بازو ہے جراروں میں ہے — جو ہتکن کو کہے باغی ہے غداروں میں ہے
دیکھتا ہے کتنا کس بل تیری تلواروں میں ہے — ہے دسیہ بٹی گلے میں تو رضاکاروں میں ہے

قاتلان شہ کو پہلے مار آکر ہند میں
ورنہ کیا لیلے بنے گا جا کے ملک نجد میں

کہہ چکا تو قاتل سرور ہیں شیعہ خاص و عام — ذاکروں کے مرتبے سے جانچ سامع کا مقام
نظم کہہ کر اس پتہ سے بھیج اب ملت کے نام — شہر دوزخ نام شیعہ ۔ عرف خونخوار امام

ہم نہیں مسلم تو ہمکو چھوڑا ہے مذہب کی زمین
کفر ذلت ہے کہ ہم ہیں تشنۂ خون حسینؑ

جو زمانے کو جگا کر آپ سو یا وہ حسینؑ　　جس نے داغ ننگ دنیا خوں سے دھویا وہ حسینؑ
رحم کی تعلیم دینے کو جو رو دیا وہ حسینؑ　　چشم مائی میں جو گم ہو کر نہ کھویا وہ حسینؑ

گر کے جس نے اسپ حق کو دوبالا کر دیا
بجھ کے شمع زندگانی نے اجالا کر دیا

نطق جس کا شرح الفاظ پیمبرؐ وہ حسینؑ　　لفظ میں جو مصطفےٰ معنی میں حیدرؑ وہ حسینؑ
جو خدائی میں خدا کی سب سے بہتر وہ حسینؑ　　جس کی ایڑی کا پسینہ جان کوثر وہ حسینؑ

حصۂ آخر عمل تھا آخری پیغام کا
سانس میں جسکی تھا دم پیغمبرؐ اسلام کا

ناز جس پر آپ کرتی ہو شہادت وہ حسینؑ　　جس نے عالم سے مٹا دی رسم بیعت وہ حسینؑ
تھی نبوت کی سپر جسکی امامت وہ حسینؑ　　جس کی نسبت سے ہو خود عزت کی عزت وہ حسینؑ

قوت اعلیٰ کو صورت میں بشر کی ڈھال کر
روح باطل کھینچ لی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

شیعہ عالم ہیں منافق مرحبا اے روزگار　　اکمل الایمان ہیں اخبار کے مضموں نگار
عالم مذہب ہے گر اہل قلم میں ہو شمار　　رائج مذہب ہے وہ ہو شاعری جسکا شعار

شاعروں کے ہاتھ میں جب سے ہوئی روح ایمان کی
لوٹی جاتی ہیں ہنسی سے آیتیں قرآن کی



یار وفادار بیرم خان خانخانہ

(از برادر معظم مولانا مولوی السید اولاد حسین صاحب شاعر پبلسٹی آفیسر رامپور)

بیرم خاں کی قوم بہکلانی مذہب شیعہ تھا یہ ان لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے اپنے قوت بازو سے ترقی کی ہے اور آخر میں بدنصیبی نے زندگی کو بیہودہ افسانہ کر دیا ہے۔ بیرم خان کی زندگی رزم و بزم کے صفحوں پر تابندہ رہی ہے اگر وہ بزم میں دلکش تصویر تھا تو میدان رزم میں شکست لباس سپاہی تھا شاعر تھا ادیب تھا موسیقی کا بے مثل ماہر تھا۔ اعلیٰ رفیق بہترین مشیر جوانمرد سپاہی تھا۔ غرض وہ صفات جو آدمی کو انسان اعلیٰ کہلانے کی سفارش کرتے ہیں وہ سب اس میں موجود تھے۔

عہد بابری میں وہ شاہی دربار میں پہنچا اور شہزادہ محمد ہمایوں کے مصاحبوں میں گنے جانے لگا۔ بابر کے بعد ہمایوں نے سلطنت ہند پر قبضہ جمایا مگر شیر شاہ سوری کی تیغ بے پناہ نے گنگا میں ڈھکیلا اور رفتہ رفتہ ایران بازگشت کرنا پڑی ہمایوں کی بازگشت و قہر کی بازگشت تھی اسلئے کہ ہندوستان ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ امرائے چغتائی کی سہل انگاری ظاہر تھی اور وطن (کابل) میں کامران مرزا و عسکری مرزا (اسکے بھائی) میرا احسان تھے ہمایوں ان دونوں کو سنی اور وہ دونوں ہمایوں کو شیعہ کہتے تھے اور شیعہ سنی میں تعاون کبھی جائز نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ کفار نے غلبہ حاصل کر لیا ہے۔

ہمایوں جو ایک دن قندھار سے لیکر بنگال تک حاکم تھا اب بے دست و پا تھا۔ امرائے چغتائی جنہیں ہمایوں کا خون (اگر ہمایوں سنی تھا) تو اسکا مذہب بھی ملا ہوا تھا۔ اسکو چھوڑ رہے تھے۔ اس کا رفیق ایک غریب شیعہ تھا جو مذہباً سنی کا قاتل تصور کیا جاتا ہے۔ یہ کون؟ وہ بیرم خان

بیرم خاں نے جب ہمایوں کو بے دست و پا اور وطن آوارہ و سرگشتہ دیکھا تو اس نے ہمایوں کی عنان توجہ شاہ طہماسپ صفوی کی کلاہ ایران کی طرف پھیری۔ امرائے چغتائی میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو ہمایوں کو یہ رائے دیسکتا۔ کیوں؟ اسلئے کہ امرائے چغتائی حنفی المذہب تھے اور ان کے ملاؤں نے قتل شیعہ کا ثواب حج اکبر کا ثواب تصور کیا تھا۔ انکی ضمیر میں سنی کی مدد شیعہ کریں یہ آ ہی نہ تھا۔ بیرم خاں شیعہ تھا۔ وہ اپنے گھر کے حالات سے واقف تھا وہ جانتا تھا کہ سنیوں کے شاہی جہازوں میں اکثر شیعہ ناخدا ہوتے رہے ہیں (اگرچہ خوف و دہشت سے تقیہ کیوں نہ کر لیا ہو) اسکو یقین تھا کہ ترکستان دور تک اور دنیا بھر کے سنی اس بڑے وقت میں کام نہ آئینگے اور اگر اس طوفان میں ڈوبتی ناؤ کا بیڑا پار ہوگا تو کسی شیعہ کے ہاتھ سے۔ بیرم خاں اسی امید پر شاہ طہماسپ صفوی کے دولت پر جا پہونچا اور خود ایلچی گری کی اور خود معاملات کو طے کیا۔ شاہ طہماسپ صفوی نے ابھی اس معاملہ کو زیر غور ہی رکھا تھا کہ شہر میں خبر اڑا دی گئی کہ نصیر الدین محمد ہمایوں حنفی المذہب ہے۔ شاہ طہماسپ صفوی بیرم خاں و ہمایوں دونوں سے کبیدہ ہو گیا۔

بیرم خاں نے شاہ کے اس کبیدگی کو قاضی جہاں قزوینی ناظر دیوان حکیم نور الدین اور خصوصاً سلطانہ بیگم خواہر سلطان کو طرفدار بنا کر دور کر دیا۔ چنانچہ سلطانہ بیگم نے ایک روز نصیر الدین ہمایوں کی سفارش گوش گذار کی۔

ہستیم ز جان بندۂ اولاد علیؑ   ہستیم ہمیشہ شاد با یاد علی

چوں سرِ ولایت از علی ظاہر شد　　　　کردیم ہمیشہ وِردِ خود نادِ علی　(دیکھو تاریخ فرشتہ)

ساتھ ہی ساتھ ہمایوں کا یہ پیغام بھی پہنچا کہ میں ہمیشہ دوستدار علی و اولاد علی ہوں چونکہ میرے بھائی کامران میرزا و عسکری مرزا حنفی المذہب ہیں۔ اسی لئے انھوں نے میرے ساتھ بغاوت کی۔ اسکے بعد ہی شاہ طہماسپ نے دس ہزار سوار و جاہ و حشم شاہانہ کے علاوہ اپنے بیٹے میرزا مراد کو بھی ہمراہ کر دیا شاہ طہماسپ نے ہمایوں سے یہ عہد بھی لے ہی لیا کہ ہندوستان میں خطبے سے خلفائے راشدین کے نام نکالدیئے جائیں اور ائمہ اثنا عشری کے اسمائے گرامی داخل خطبہ کر دیئے جائیں۔ ہمایوں نے اگرچہ اقرار کر لیا تھا مگر وہ اپنی زندگی میں ایسا نہ کر سکا اور اس نے اظہار و اعلان مذہب میں تدریج چاہی تھی جو موت کی جلد بازی سے پوری نہ ہوئی۔

اگرچہ عموم حنفی اسکو حنفی المذہب ہی جانتے رہے مگر اسکا مذہب دس کے اہل خاندان سے پوشیدہ نہ تھا۔ کامران مرزا و عسکری مرزا جو اسکے بھائی تھے وہ ہمایوں کو شیعہ ہی جانتے تھے۔ ہمایوں بھی تدریجاً آگے بڑھ رہا تھا کہ اسکے امرا میں شیعہ زیادہ تھے شیعوں کی عزت و منزلت و مراتب میں روز افزوں ترقی تھی تقریباً بھی وہ شیعہ مذہب کی حمایت کرتا تھا کامران مرزا کے ساتھ ایک روز سوار ہوا اتفاقاً کامران مرزا کی نظر ایک کتے پر پڑی جو ایک قبر پر پیشاب کر رہا تھا کامران مرزا نے کہا ظاہرا ایں قبر رافضی است ہمایوں گفت بلکہ سگ سنی است (دیکھو تاریخ فرشتہ)

شیر شاہ سے شکست کے اسباب ہی تھے امرائے چغتائی نے صرف اس لئے سہل انکاری کی کہ ہمایوں کے امرا میں شیعہ زیادہ اور معزز عہدوں پر سرفراز ہو رہے تھے بیرم خاں ان شیعوں میں بھی اول درجہ پر فائز تھا اور ہمایوں نے اسکو خان خانہ کے علاوہ یار وفادار و ہمدم و غمگسار کا بھی لقب دیا تھا اسکے ملازم دیوان سرکار سے تنخواہ پاتے تھے۔

امرائے چغتائی ایک شیعہ کی اس ترقی کو ٹھنڈے دل سے نہ دیکھ سکتے تھے انکے پاس اسوقت کی فضا کو دیکھتے ہوئے ایک ہی آلہ کار تھا کہ وہ بیرم خاں کی نمک حرامی ثابت کریں چنانچہ جب بیرم خاں قندھار میں داد حکومت دے رہا تھا تو امرائے چغتائی نے صاف صاف ہمایوں سے کہا کہ بیرم خاں شاہ طہماسپ کا ہم مذہب ہے وہ شاہ ایران سے سازش کر کے کم از کم قندھار کو عجم کے حوالے کر دیگا۔ ہمایوں کو یوں بھر آگیا کہ آخر بادشاہ نے قندھار پر دھاوا بول دیا۔ مگر وہاں بیرم خاں مقاتلہ و مجادلہ کے خیال سے بھی ناآشنا تھا وہ استقبال کو بڑھا اور معاملہ صاف ظاہر ہو گیا۔

بیرم خاں جیسا بے تقیہ شیعہ تھا اسی طرح اپنے آقا کا سچا جانثار اور وفادار بھی تھا وہ ہمایوں کے مخالف اپنے کسی ہم مذہب کی رعایت نہ کرتا تھا شاہ ابوالمعالی بھی شیعہ و سید تھے مگر حکومت پنجاب حاصل ہونے کے بعد سکندر شاہ کے مقابل انھوں نے سرکاری فوج کی جیسی چاہیئے ویسی مدد نہ کی بیرم خاں نے فوراً انکو قید کر دیا اگرچہ اب دور اکبری شروع ہو گیا تھا۔

نصیر الدین محمد ہمایوں نے دہلی میں کوٹھے سے گر کر دفعتہً انتقال کیا "ہمایوں بادشاہ از بام افتاد" تاریخ وفات ہے اسوقت اکبر پنجاب میں تھا اور تیرہ سال کا لڑکا تھا بیرم خاں اکبر کا اتالیق تھا شیعہ امرا ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہمایوں کے دوبارہ تسلط کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا، اہل ملک غیر ملیوں کی حکومت کا جوا اتار پھینکنے پر آمادہ تھے ہیمو بقال کی جوانمردی تسخیر ممالک کرتی جاتی تھی۔ اس حالت میں بیرم خاں کیلئے کافی موقع تھا

کہ وہ اکبر کو زندہ درگور کرکے بیرم خاندان شاہی کی نیو ڈالدے۔

تاریخ ہندوستان کے مطالعہ کرنیوالوں سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ولیعہد کی کمسنی دارالسلطنت سے دوری ہندوستان کی اسلامی شاہی کے لئے کسقدر خطرناک کیفیت ہے۔ ہندوستان کی شاہی میں سیکڑوں انقلاب ہوگئے اور ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں شاہی منتقل ہوئی اس کا اکثر سبب یہی ہوا کہ ولیعہد کمسن و نابالغ تھا بھائی نے بھائی کو قتل کیا غلام نے آقا کو ذبح کیا اور تخت شاہی پر قبضہ جما لیا پھر لطف یہ کہ بادشاہی حاصل ہوتے ہی کسی نے اوسکی محسن کشی اور اسکے قتل عمد پر توجہ نہ کی اور مرنے کے بعد سلسلہ اولیا میں شمار ہونے لگا۔

درحقیقت یہ اصولی غلطی صدر اسلام سے شروع ہوئی تخت نشینی اجماع و انتخاب پر منحصر ہوکر اتنی عام ہوئی کہ غلام و آقا کی پاسداری اٹھا دی گئی اگرچہ حقوق شاہی کا عام ہونا مساوات اسلامی کی زبردست دلیل بتائی جاتی ہے مگر کوئی معیار انتخاب تھا نہ صورت تشخیص شخصی ذاتی اثرات کا رسوخ تھا اور ملک و قوم کی ترجمانی کوسوں دور تھی آخر خلفائے راشدین کے بعد یہ راز پس پردہ نہ رہا اور اصول خلافت میں جبر تسلیم کر لیا یعنی جسکی لاٹھی اسکی بھینس۔ حجاز و عراق و عجم و ہندوستان و مصر و اندلس کی اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ شاہی کے دیوتا پر کتنے بھینٹ چڑھائے گئے ہیں اور کسقدر قبائل کٹ مرے۔ چنانچہ تاریخ ہندوستان کو بھی دوسرے لفظوں میں مقتل کہا جاسکتا ہے۔

غرض بیرم خاں اکبر کے ساتھ تمام وہ کارروائیاں عمل میں لاسکتا تھا جو ہندوستان کے عہد اسلام کی سنت کہلائی جاسکتی ہیں مگر اسکی نمک حلالی نے محسن پرستی و فرض شناسی نے ایسا نہ کرنے دیا۔ ہندوستان کا امن عامہ اسوقت کیا تھا یہ اس سے ظاہر ہے کہ اکبر کو تخت نشینی کیلئے دارالسلطنت تک لانا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا اسلئے بیرم خاں سے ہوشمند نے پنجاب ہی میں (کلانور) اکبر کی تخت نشینی کر دی اور جب عام قلعہ داران اور صوبہ داروں کو تخت نشینی کی اطلاع دے دی۔ تو اکبر کو لیکر دارالسلطنت میں آیا۔

اکبر نے بیرم خاں ہی کو صرف اپنا مددگار پایا اور اسنے نصرتاً تمام امور ملکی و مالی اسکے سپرد کئے بلکہ یہ بھی کہا ہر چہ صلاح دانی تعمیل آوردہ موقوف بر حکم من نداری (دیکھو تاریخ فرشتہ) بیرم خاں سا ہوشمند اس اختیار عام سے خوش نہوا وہ ان زریں تبان آدمی کی تلون مزاجی سے واقف تھا بیرم خاں کو لقب خان بابا نے بھی مغرور نہ کیا تھا وہ جانتا تھا کہ دولت کیلئے باپ بنا لینا بہت آسان ہے۔ اس نے شاید اس اختیار سے اپنا خوف و ہراس ظاہر کیا۔ دشمنوں کی دشمنی سے اپنا عجز بیان کیا۔ مگر یہ وقت اکبر کے لئے نازک وقت تھا اس نے روح ہمایوں اور اپنے سر کی قسم کھائی یہ مصرع پڑھا۔

دوست گر دوست بود ہر دو جہاں دشمن باد

بیرم خاں نے مجبور ہوکر امر وزارت و وکالت کو قبول کیا اور اپنی مرضی پر کام شروع کر دیا۔ بیرم خاں کی وزارت نے اکبر کو نقصان پہونچایا یا اکبر کو اکبر بنایا اسکا فیصلہ تاریخ کے مطالعہ پر منحصر ہے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں بغاوت کی بازار سرد ہوگئی۔ امن و امان کا سکہ نافذ ہوگیا شاہی ممالک جو ہاتھ سے نکل چکے تھے وہ قبضہ میں آگئے اور جہاں روح ہمایوں نہ پہنچ سکا تھا وہاں شمشیر اکبری جا پہنچی۔

سب سے پہلے بیرم خاں نے ہیمو بقال کا معاملہ طے کیا جس نے دارالسلطنۃ آگرہ و دہلی دونوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس جنگ میں ایک مسیح

باغی بھی حامیوں کی ہیمو بقال کے مقابل ہیں جو ہیمو جو فروشان گندم نما تھے اور جنہوں نے بھاگ کر دہلی کا راستہ اختیار کیا تھا اس کے سوا اعظم کو بڑی بغاوت بادشاہ قتل کروایا۔ اسی جنگ نے اکبر کی شاہی مسلم اور منافقوں کے مطالب کو پنیہ اور مخبروں کی قوت بلند سے جاہلوں کی طرح اکبر کی سلطنت دوبارہ مضبوط ہوگئی۔ مگر اسی جنگ کے بعد امرائے چغتائی نے بیرم خاں و اکبر کے درمیان تفرقہ ڈالنا شروع کر دیا۔ سکندر شاہ پر فتح ہو چکی تھی بیرم خاں کے خیمہ پر دو فیلان جنگی جا پہنچے مگر بیرم خاں قسمت سے بچ گیا۔ بیرم خاں کے خیمے تک ایک مرتبہ ایک ہاتھی جنگی فیل جا پہنچا مگر بیرم خاں فیل خانے سے باہر جا چکے تھے دریائے جمنا میں بیرم خاں کی کشتی پر فیل جنگی نے حملہ کیا مگر مخبر حیات تو قسمت کی امر سے بچا لے گئیں۔

اگرچہ ہر مرتبہ اکبر نے عذر معذرت سے کام لیا۔ بیرم خاں نے فیلبانوں کو قتل کرا دیا یہ سب کچھ ہوا لیکن ایک قسم کے جذبات کو اتفاق سے تعبیر کرنا عجیب بے معنی تاویل ہے۔

بیرم خاں جیسا سچا وفادار و نمک حلال تھا ویسا ہی پکا شیعہ بھی تھا امرائے چغتائی کا بڑا حصہ جاہل تھا اور ان سے تعصب کا اظہار ہوتا رہتا تھا بیرم خاں بھی اسی اعتبار سے اعلان مذہب میں کمی نہ کرتا تھا امرائے چغتائی کا مضبوط پایہ یہ تھا کہ بادشاہ وقت اکبر اعظم اس وقت تک حنفی المذہب تھا۔ مگر مذہب کے معاملہ میں بیرم خاں کسی قسم کا دباؤ اٹھانا پسند نہ کرتا تھا صاف صاف کہتا تھا۔

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسر او   اگر غلام علی نیست خاک بر سر او
ولائے آل محمد نمی خرند بہ سرے   کہ دست غیر گرفت ست پائے مادر او

مطلع کی تلمیح سے اکبر واقف نہ تھا شعر ثانی کے حدیثی تطابق سے ملا پیر محمد شیروانی کو ایک مخفی جستجو لازم ہو جاتی تھی۔ ملا پیر محمد اس وقت تک بیرم خاں ہی کے نمک خوار و بہی خواہ تھے جس وقت تک شاید ملائیت کا دعویٰ نہ تھا جب ملا ہوئے اسی وقت سے پروٹسٹنٹ کی حسب آگ بنانے کی فکر ہوئی۔ خان زمان علی قلی خاں کی شیعیت پر بہلا کے تعصب جتانا چاہا۔ اسی نام ہی سے حقوق سلطان کے ساتھ تہمت تراشی کی اور جب فرخ علی خانزاد کا اقبالی) عرض حال یا عذر و معذرت کے لئے ملا صاحب کے شریعت کدہ پر پہنچا تو آپ نے حنفیت چھوڑ کر سنت عبید اللہی پر عمل فرمایا بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے عبید اللہ ابن زیاد نے تو ایلچی امام حسین ع مسلم ابن عقیل کو بعد قتل کے قلعے سے زمین پر گرایا تھا۔ ملا پیر محمد نے فرخ علی کو لاتوں لاتوں سے مارا اور پھر قلعے سے نیچے گرا دیا۔ فرخ علی شہید ہو گیا اور شاہم بیگ بادشاہ کی خدمت میں چلا گیا کہ ایک عجیب واقعہ کی اطلاع سے قبل قتل ہو گیا۔

بیرم خاں نے جب یہ رنگ دیکھا تو ملا پیر محمد اور ان کے ہواخواہوں سے انتقام کی ٹھانی مصاحب بیگ قتل ہوئے ملا پیر محمد معزول کئے گئے اور سب سے بڑا انداز یہ کیا گیا کہ شیخ گدائی جو مشہور شیعہ تھے حنفی المذہب بادشاہ کے عہد میں قاضی شہر کر دیئے گئے امرائے چغتائی بھلا اس مذاق پر کیا صبر کر سکتے تھے ان کا ضمیر یہ کیوں قبول کرتا کہ سال کے تین سو پینسٹھ روز میں سے چند روز اقلیت کے حقوق کا لحاظ بھی لازم ہو۔

خانخاناں بیرم خاں و خان زماں علی قلی خاں ایک طرف تو اس جنگ مذہبی میں تلواریں سونتے کھڑے تھے دوسری طرف وہ اپنے مالک کے مخالفین کے سامنے داد جوانمردی دے رہے تھے اور اس حالت پر بھی ممالک مفتوحہ کی فہرست طویل ہوتی جاتی تھی چنانچہ اسی سال خانخاناں کی تدبیر نے قلعہ گوالیار کا دروازہ کھولا اور خان زماں علی قلی خاں نے شیر شاہ کے افغانوں سے ممالک مشرقی فتح کر کے بنارس و جونپور بادشاہ کے نذر کئے۔ لیکن اب اکبر بھی صرف کار خدمت پر اظہار خوشنودی کے لئے تیار نہ تھا بلکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ خانخاناں شیعہ ہے اسلئے یہ فتوحات اوسکو خوش نہ کر سکے اور شیخ محمد غوث اور برادر شیخ بہلول سے ملاقات نہ ہونے کا بہانہ مزید ناخوشی کا باعث ہوا۔ ان فتوحات و خدمات پر خاک ڈالی گئی اکبر اعظم بحیلہ شکار آگرہ سے دہلی پہنچا۔ شہاب الدین و ادہم خاں نے وہاں یہ سمجھایا کہ گویا بادشاہ بیرم خاں کا نظر بند ہے اور اسکی بلا اطلاع آمد و رفت اسکے عہدہ داروں کے لئے خطرناک ہے۔ بادشاہ تو ہمیشہ ایسی ہی جماعت کے افراد ہوتے ہیں جنکا اعتبار صرف وقت ساعت پر ہوتا ہے۔ وہ تحقیق و تدقیق کے جھگڑوں میں کم پڑتے ہیں۔ لہذا اکبر اعظم برہم ہوا اور ایسا کہ یہ خفگی پوشیدہ بھی نہ رہی۔ اب امرائے چغتائی کے لئے راستہ صاف تھا اور دنیا کا کوئی عیب باقی نہ رہا جو بیرم خاں میں پیدا نہ کر دیا گیا ہو۔

بیرم خاں نے اولاً تو عذر معذرت کی تحقیق حال کا مطالبہ کیا۔ مگر جب دیکھا کہ دشمن کامیاب ہو چکے اور بادشاہ مکدر رہے تو اوس نے حسن خدمت کو وسیلۂ شفاعت کرنا چاہا مگر تقدیر بھی اب کچھ اور کہہ رہی تھی اس نے ملک مالوہ اور بنگالہ کی تسخیر کا ارادہ تو کیا۔ مگر فتح کہیں نصیب نہ ہوئی اور یہ سعی ناکام باعث خجالت ہو گئی اوس نے یکایک ترک دنیا کی ٹھانی اور ارادۂ حج بیت اللہ کیا۔ مگر اپنی خدمات کو یاد کر کے اکبر اعظم سے امیدوار عفو ہو گیا۔

آخری مرتبہ اس نے امرائے چغتائی کی اعانت سے قطع نظر کر کے اپنے ذاتی جاہ و حشم سے کام لینا چاہا۔ پنجاب پر دھاوا کیا۔ مگر اوسکے بہلانے دوستوں نے اس جنگ کو بغاوت ٹھہرا دیا۔ بادشاہ نے مولانا عبد اللطیف قزوینی کو بیرم خاں کے پاس بھیجا بیرم خاں اگر بغاوت کا ارادہ کر چکا ہوتا تو اسکے لئے لازم تھا کہ یا تو وہ شاہی ایلچی کو گرفتار کرے یا حیلہ و حوالہ کر کے ٹال دے اور اپنے کام میں مصروف ہو جائے مگر اس نے وفادارانہ طرز عمل باقی رکھا اور اپنا ذاتی جاہ و حشم جس نے اوسکو باغی کا لقب دیا تھا مع نقارہ طبل و علم فیل حسین قلی بیگ کے ساتھ نذر بادشاہ کر دیئے۔ مگر تعجب ہے کہ اس پر بھی اکبر اعظم نے اوسکی بغاوت کا یقین باقی رکھا بلکہ دوبارہ اوسکے مقابلے کے لئے ایسے شخص کو تجویز کیا گیا کہ بیرم خاں اوسکے مقابل میں ہتھیار ڈالنا اپنی ذاتی ذلت جانتی اور اسکے لئے بے جنگ چارہ کار باقی نہ رہے یہ شخص بیرم خاں کا پرانا ملازم ملا پیر محمد تھا جسکو لقب خانی و نقارہ و علم بھی بادشاہ سے دلایا جا چکا تھا۔

بیرم خاں کی زندگی اب ایک بدقسمت کی زندگی تھی برا وقت آ چکا تھا۔ دسترخوان کی مکھیاں اوڑ رہی تھیں۔ سامان جاہ و حشم کے وابستہ ہوتے ہی اسکے ساتھی بھی چھوڑنے لگے بلکہ چلتے چلتے خانخاناں کے اردو میں ڈاکہ بھی ڈالتے گئے۔ انہیں شاہ ابو المعالی کا حصہ خصوصی تھا مگر شاہ ابو المعالی کی غارتگری کا نتیجہ کچھ اچھا نہ ہوا اس مرتبہ اکبر اعظم نے اوسکو قید کر دیا۔

بیرم خاں کا عجب عالم تھا وہ امید و بیم میں مبتلا تھا کبھی مایوس ہو جاتا تو بیکانیر تک ارادۂ حج کرکے چلا جاتا پھر امیدوار ہوتا تو پنجاب میں واپس آجاتا۔ مگر بدقسمتی ہمراہ رکاب تھی اوسکی یہ آمد و رفت بھی بغاوت ٹھہری اور مفروضہ فتنہ بیرم خان کیلئے ملا پیر محمد اور پھر خان اعظم شمس الدین مقرر ہوئے ان دونوں کو جو عداوت بیرم خاں سے تھی وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ ملا پیر محمد نہ صرف بیرم خاں بلکہ اسکے مذہب کا دشمن تھا اور خان اعظم ملا صاحب کے مرید تھے۔ یہ خان اعظم وہی تھے جنھوں نے اکبر سے آخری چغلی کھائی تھی۔ اکبر اعظم اب بچہ نہ تھا بیرم خاں کے مقابل میں ان دونوں ناموں کی تجویز خود بتاتی ہے کہ اکبر اعظم یہ چاہتا تھا کہ بیرم خاں جنگ کرکے بغاوت کا ملزم ہوجائے اور اس طرح اوسکا قتل ممکن اور جائز ٹھہر سکے۔ چنانچہ یہ جنگ ہوئی بیرم خاں کے بقیۃ السیف دوست بھی تہ تیغ ہوئے اور وہ کوہ سوالک کیطرف فرار ہوگیا۔

اس کے بعد اکبر اعظم خود بھی سیر پنجاب کا حیلہ کرکے کوہ سوالک جا پہنچا نہیں معلوم اوسکا کیا ارادہ تھا مگر بیرم خاں کو آخری موقع ملا اور وہ ملا عبد اللہ مخدوم الملک کی ہمراہی میں عذر خطا کو آیا بادشاہ کے پاؤں پر سر رکھدیا۔ اکبر نے بظاہر خطا معاف بھی کی اوسکی قدر بھی بلکہ برابر اوسکو بٹھایا بھی بعض علاقے بھی دینے کا ایما ظاہر کیا قیام و سفر دونوں کا اختیار دیا۔

مگر بیرم خاں بیوفائی عالم دیکھ چکا تھا اوس نے امارت پر حج و زیارت کو ترجیح دی بادشاہ نے پچاس ہزار روپیہ حج کے لئے دیا اور وہ حج کے ارادے سے گجرات کی طرف روانہ ہوا (بیرم خاں کے حسن خدمت کو دیکھتے ہوئے بادشاہ کے آخری عطیہ کی تعداد قابل غور ہے)

بیرم خاں پٹن گجرات میں پہونچا جہاں سے وہ سفر دریا کرنیوالا تھا۔ ایک روز تفریحاً گجرات کی سیر کرکے واپس آرہا تھا کہ مبارک خاں نے راستے میں مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے اور اسی حیلہ سے چند وار خنجر کے کرکے بیرم خاں کا کام تمام کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ مبارک خاں کا باپ کسی لڑائی میں ملازمان بیرم خاں کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا جسکے انتقام میں بیرم خاں کو نہ صرف دھوکے سے قتل کیا گیا بلکہ اوسکا قافلہ بھی قتل و غارت سے محفوظ نہ رہا اور اسکی لاش بھی تین روز محتاج دفن رہی کسی نے بیرم خاں کی تاریخ کہی ہے ؎

بیرم بطواف کعبہ چوں بست احرام — در راہ شد از شہادتش کار تمام

در واقعہ ہاتفے پے تاریخش — گفتا کہ شہید شد محمد بیرام

بیرم خاں کی شہادت کے بعد بادشاہ اوس کے چار سالہ فرزند عبد الرحیم خانخاناں کو اور بیرم خاں کی زوجہ کو لیکر بمشکل دربار شاہی میں پہونچا جہاں یہ لطیفۂ غیبی پیدا ہوا کہ بیوۂ بیرم خاں محلات شاہی میں داخل کرلی گئیں۔ بیرم خاں کی شہادت اگرچہ اکبر کے اشارہ سے نہو مگر چند سوال ایسے ہیں جنکا جواب تاریخ کے مطالعہ سے نہیں ملتا۔ (۱) بیرم خاں کے قاتل سے کوئی انتقام نہیں لیا گیا نہ اسکی گرفتاری کی فکر کی گئی (۲) بادشاہ خطا معاف کرچکا تھا پھر اب کسکا خوف تھا جو بیرم خاں تین روز دفن سے محروم رہا (۳) بیرم خاں کی بیوہ ترغیباً داخل محلات ہوئی یا پہلے سے کوئی خلش اکبر کے دل میں موجود تھی۔

اولاد حسین شاعر ۱۰/ نومبر ۱۹۳۱ء

آہ جوانان مرگ ہا تف

(ہم کس طرح لکھیں اور کیونکر کہیں کہ کل ہمارے پاس جو پہلو بہ پہلو مشاعروں میں بیٹھکر غزل پڑھتا تھا جو چند روز پہلے ہمارے ساتھ بیٹھتا اوٹھتا تھا۔ آہ آج قبر کی منزل میں ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔ ہاتف مرحوم کا سن بیس سال سے کسی طرح زائد نہ تھا۔ اس سن کو دیکھئے اور مرحوم کی علمی قابلیت، اخلاق حسنہ۔ شاعری میں کلام کی پختگی پر غور کیجئے بہرحال مشیت ایزدی میں کسی کو چارہ کار نہیں۔ خداوند عالم اُن کے والد ماجد جناب واقف لکھنوی اور انکے بڑے بھائی جناب اختر لکھنوی اور اُنکے منجھلے بھائی جناب کشور لکھنوی کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو درجات عالیہ عطا فرمائے ذیل میں ہم مرحوم کی ایک غزل درج کرتے ہیں۔ اُنکے کلام میں زائد تر اشعار موت کی یاد دہانی کرتے ہیں۔ جیسا کہ ذیل کی غزل سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایڈیٹر)

غزل سید رضا آغا عرف راجہ میاں مرحوم المتخلص بہ ہاتف شاگرد جناب ذبیح صاحب عبل ہندیؔ حضرت ذاخر مدظلہ العالی

پھیلے اثر جو سوزِ دلِ داغ دار کے
تختے زمین کیطرح جل اٹھے مزار کے

ساماں کئے ہیں یہ شب تار مزار کے
روشن رہیں گے داغ دلِ زخمدار کے

تربت پہ شام ہی سے ہواؤں کا ہے اثر
شعلے بھڑک رہے ہیں چراغ مزار کے

کہتا ہے دل کہ منزل مقصد تک آ گئے
جلوے دکھائی دینے لگے کوئے یار کے

دیکھیں عدم کی راہ میں کس طرح ہو گذر
آگاہ ہم سے نہیں اس دیار کے

اک سے نہ دیکھی جائیگی تربت کی تیرگی
ہٹ جائیں لوگ قبر پہ مجھکو اتار کے

جب اپنے مرنے والوں سے پایا نہ کچھ جواب
[illegible]

تجھے شایق بہار جو ہم سے خزاں نصیب
لائیں ہوائیں پھول چمن [illegible] کے

قبر شہید ناز پہ یوں فاتحہ پڑھو
دو چار پھول ڈال دو سہرے اتار کے

قبر شہید ناز سے کیوں وہم کرتے ہو
لیجاؤ چنکے پھول ہمارے مزار کے

کب درد ہجر سے گھٹ گیا اور کب ہوئی سحر
حالات کیا کہوں میں شب انتظار کے

سچا افسانہ

از جناب بہزاد ذ احسنری لکھنوی

(اپنے نظارہ کے لئے)

اختلاج قلب ایسی مہمل اور ذلیل بیماری ہے جسکا حد و حساب نہیں۔ اسکا شکار بہ ظاہر تندرست اچھا خاصا لیکن بباطن دنیا کے ہر کام سے بیکار رہتا ہے۔ خدا نہ کرے کسی کو یہ سوداوی مرض ہو۔ اور اگر ہو تو وہ شاعر اور افسانہ نگار نہو۔ اور اگر بدقسمتی سے یہ دونوں باتیں جمع بھی ہو جائیں تو اسکا کوئی صحبت کرنے والا دوست کسی رسالے کا ایڈیٹر نہ ہو اور اگر یہ سب باتیں بھی بدقسمتی سے مجتمع ہو جائیں تو یہ ایڈیٹر حضرت فضل لکھنوی کی ذات اقدس ہو۔ وگرنہ ایسے افسانہ نگار کی موت یقینی ہے۔ آپکی ذات اقدس کے سامنے کوئی گھسا کوئی بٹی۔ کوئی جرکہ۔ کوئی ترکیب کارگر نہیں ہوتی آپ کے احکام" افسانہ لکھا" "لاؤ" "کیسی فکریں" ہم نہیں جانتے" "کل کبھی نہیں آتی" "ابھی لکھو" غرض یہ وہ جملے ہیں جو ایک EXPOLSION سے کسی طرح کم نہیں۔ اب خواہ غریب آلام دنیوی کا شکار کیوں نہو۔ خواہ اس پر زمانہ کی فکریں ہی کیوں نہ پھٹ پڑیں۔ افسانہ لکھئے گا اور ضرور لکھئے گا۔ لیکن کیا دماغ قابو میں نہیں پلاٹ ذہن میں نہیں۔ لیکن جوئندہ یابندہ ڈھونڈھے سے خدا ملجاتا ہے نہ کہ ایک افسانہ۔

(۱)

میں نے اسکو دیکھا اور پہلی ہی نظر میں پہچان لیا، وہ امین آباد میں یکوں کے اڈہ کے پاس پان کھا رہا تھا۔ اسکی پوشش اور وضع میں بیحد فرق تھا۔ اسکی ڈاڑھی تقریباً ایک بالشت طویل وہ ایک سیاہ رنگ کے کوٹ اور ایک گاندھی ٹوپی میں ملبوس تھا۔

عارف میں نے پکارا

وہ۔ پلٹا۔ ااں۔ تم ہو بہزاد۔ اسنے اپنی پرانی بے تکلفی کے ساتھ کہا۔

خدا کا شکر ہے میں نے جواب دیا۔

میں اسکو زبردستی ہند و مسلم رسٹوران میں لے آیا جہاں اس نے صرف بسکٹ قبول کئے

آجکل کیا کرتے ہو۔ میں نے پوچھا۔

بیکاری ؟

اور ارادہ ؟

موت۔

واہ۔ میں نے کہا یہ تو بالکل شاعرانہ تخیل ہے ؟

وہ ہنسا اور اُس نے کہا میں شاعر ہو گیا ہوں۔

تو کچھ سناؤ۔

پرانا سُنکر کیا کروگے تم طرح دیدو میں ابھی ابھی کہہ دیتا ہوں۔

مجھے تعجب سا ہو گیا۔ اس لئے کہ ایام طالبعلمی میں جب وہ میرے ساتھ تھا وہ شاعری سے بیحد متنفر تھا خوش پوشاک اور کرزن فیشن کا خوبصورت انسان تھا۔ مجھے حضرت فضل لکھنوی کا ایک مطلع یاد تھا میں نے پڑھ دیا۔

بیٹھے تو تھے خوشی سے اُس بزم سے کے اُٹھے ۔۔۔ پوچھا نہ جب کسی نے مجبور ہو کے اُٹھے

وہ فوراً گنگنانے لگا بمشکل چند منٹ گذرے ہونگے کہ اُس نے کہا سنو۔

بیٹھے تو رو کے بیٹھے اُٹھے تو رو کے اُٹھے ۔۔۔ ہم اپنے آنسوؤں سے دنیا ڈبو کے اُٹھے

اُن سے نظر ملا کے تکمیل عشق کر لی ۔۔۔ لے دے کے ایک دل تھا تو وہ بھی کھو کے اُٹھے

میں متحیر سا رہ گیا۔ اسکا مطلع اور یہ شعر دلی جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے یکایک گھڑی نے پانچ بجائے اور میں نے کہا بھائی تم ٹھہرے کہاں ہو۔

دریبے گنج کی سرائے میں

اچھا میں کل آؤنگا اب مجھے اجازت دو۔

کیوں۔ اسقدر جانیکی جلدی ہے۔

میں نے جواب دیا کہ مجھے نگارہ کے لئے افسانہ لکھنا ہے اور وقت کم ہے۔

"تم بھی میرے حالات کے لئے بیچین ہو سنو۔ میں تمھیں اپنا واقعہ سناتا ہوں جس کو تم بطور افسانے کے دے سکتے ہو صرف اسکا خیال رکھنا کہ نام اور مقامات تبدیل کر دینا۔

میں اور تم انٹرنس پاس کرنے کے بعد جدا ہوئے تم لکھنؤ اور میں پنجوطنی اپنے گھر چلا گیا۔ والدین تم جانتے ہو کہ میرے بچپن ہی میں انتقال کر چکے تھے میری تعلیم اور پرورش میری پھوپھی نے کی۔ میں گھر پہونچا اور بالکل بیکار کیونکہ میں نے ابھی طے نہیں کیا تھا کہ آیا میں تعلیم جاری رکھوں یا کہیں بیس روپیہ ماہوار کی کلرکی کروں میرے محلہ میں ایک دہلوی سوداگر رہتے تھے۔ بڑے امیر کبیر۔ ان کی ایک صاحبزادی تھیں :-

"قیصر" آہ کیا پیارا نام ہے"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

بیگناہ جسم ۔ مخمور آنکھیں ۔ دلکش ترین چہرہ کی مالک تھی۔ ستم تو یہ تھا اس کے پہلو میں ایسا ہی دل بھی ہوتا ۔ اُس ظالم نے میری زندگی کو تباہ اور ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا ہے۔ میں اس حقیقت کو کہ غضب کا حسن اور تنگ کرتے گے گنتا محض شاعرانہ تخیل سمجھتا تھا لیکن اس حسین کافرہ نے مجھے سب سچ کر دکھایا۔

ہاں تو میں کہاں بہک گیا۔ میں ایک دن دوپہر کے وقت گلی سے گذر رہا تھا یکایک سامنے دروازہ میں نمودار ہوئی میری اُس کی پہلی بار نگاہ پڑی اور میرا تمام جسم سن سن کرنے لگا۔

کاش یہ گھڑی کبھی نہ آتی۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ اسکا تبسم در اصل عشق کو دعوت دے رہا تھا۔

پھر تو یہی روزانہ ملاقاتیں ہونے لگیں اور بہت سے مقصد مختصر تمام وقت لگا لیکن تم ملازم ہو کر بردوان جا چکے تھے۔

میں نے کہا ہاں ۱۹۲۶ء کا ذکر ہے۔

اُس نے پانی مانگا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔

سنو۔ اُس نے کہا تم یقین مانو۔ وہ دیوی تھی اور میں اسکا پجاری۔ نماز میں بھی اسی کا تصور رہتا تھا۔ دن میں کئی بار وہ مجھ سے ملاقی ہوتی تھی۔ اسکے خط بھی میرے پاس آتے تھے اور بہت سے ہیں یہ خط وہ زائد تر ان موقعوں پر بھیجتی تھی جبکہ وہ کہیں تقریب میں ہماری ہجر اور سنہری انتظار کی وحشت بچانا چاہتی ہو۔

ان ملاقاتوں کو چھ ماہ کا عرصہ گذر گیا۔ اس واقعہ سے تمام محلہ میرے گھر والے اور اسکے گھر والے سب آگاہ ہو گئے کسی نے سچ کہا ہے

عشق و مشک نہیں چھپتا

مجھے تعجب اس بات کا تھا کہ ان لوگوں نے کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کی ہم لوگ اس طرح بیباکانہ روزانہ ایک دوسرے سے ہمکلام ہوتے تھے یکایک یہ ملاقاتیں رک گئیں میں گھبرا گیا۔ میں اس صدمے کے لئے تیار نہ تھا میرا دل و دماغ ضعیف تھا۔ ایک ماہ اسی حالت میں گذرا میری تکلیف کو نہ پوچھو میں نیم دیوانہ تھا۔

میری پرستش۔ لباس۔ وضع قطع۔ گفتگو ہر شے سے ایک مجنونیت آشکار تھی۔

تم پاس تھے تو تھا مجھے احساس زندگی
تم دور ہو تو پھر انہیں اپنی خبر نہیں

میں اس خفگی کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا بڑی دعاؤں کے بعد اس سے ایک دن ملاقات ہوئی۔ اس نے ذیل کے جملے مجھ سے کہے جو اب بھی یاد ہیں اور یاد رہینگے۔

ناصر میرا دل محبت کے اثرات قبول کرنے سے معذور ہے۔ میرا دل ایک پتھر ہے میں صرف [illegible] اس وقت حسن کا امتحان کرنا

[illegible] دل لگانا تھا اور نہ کسی سے کبھی ہوگا۔

یہ جملے میرے واسطے پیغام موت ہوگئے۔ میں نے اپنا تمام سامان بیچ ڈالا۔ وضع قطع تبدیل کرلی۔ داڑھی بڑھالی۔ دلی جذبات نے مجبور کرکے شاعر بنا دیا۔ سنتا ہوں کہ لڑکی کی شادی ہونیوالی ہے اور ہونے والے شوہر صاحب بڑے رنگین اور عیاش طبع ہیں۔ بہر طور

میں اُسکے لئے ہمیشہ دست بدعا ہوں اور رہونگا۔

کہ اللہ اسکو خوش اور سالم رکھے

بھائی فضل کی خدمت میں افسانہ پیش ہے۔ افسانہ کم اور آپ بیتی زیادہ [illegible] واقعہ ہے جس نے تقریباً وہی لفظیں رکھ دی ہیں جو سنی تھیں۔ [illegible] کچھ بھی ہے وہ نظارہ کی نذر ہے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

بہزاد لکھنوی

فطری جذبات

از حضرت ہدف اجتہادی

وہ تصور میں ہمارے آئیں کیا اور کیا گئیں
ایک بجلی تھی جو دل میں شام غم دوڑا گئیں

سامنے میرے اگر بھولے سے بھی وہ آ گئیں
چار آنکھیں ہوتے ہی گھبرا گئیں شرما گئیں

میں جب دل میں اٹھی اک آہ کی چپ ہو رہے
ہجر کی راتیں یوں ہی گذریں یوں ہی پھر آ گئیں

وہ نظر ... میں درد دل سمجھتا رہا
انکے خط کی شوخیاں مجھ کو کچھ ایسی بھا گئیں

شکر کرنا تھا انھیں بدنامیوں سے بچ گئیں
وہ تو سنتے ہی ہماری موت کو گھبرا گئیں

منکی اُن ترچھی نگاہوں کا اثر ہے آجتک
جو کہ آنکھوں سے گذر کے دل مرا برما گئیں

یوں تو شکوے تھے بہت پیارے مرے بیچین دل
کیا میں کہتا جب وہ صورت دیکھکے شرما گئیں

... شام غم تصور میں تو چھپنا ہی نہ تھا
بیٹھے بٹھلائے مجھے تڑپا گئیں رلوا گئیں

سختیاں فرقت کی اُن سے ذکر کرنا ہی نہ تھیں
پڑھتے ہی پڑھتے ہمارے خط کو وہ کھسیا گئیں

دل پھڑک کے رہ گیا تصویر اُن کی دیکھکر
ہائے وہ ساکت ادائیں بھی مجھے تڑپا گئیں

دل کو تسکین ہو چاہے نہ آئیں سامنے
آنکھوں آنکھوں میں خدا جانے وہ کیا سمجھا گئیں

گو رہیں بیچین وہ بھی میری آہوں سے مگر
ایک خاموشی میں سب دلداریاں دکھلا گئیں

پہلے تو سنتی رہیں، کہتا رہا میں حال دل
اک شکایت پر اتر نا تھا کہ بس شرما گئیں

دل کے گلدستہ میں جو کلیاں تمناؤں کی تھیں
انتظار دید میں سب بن کھلے مرجھا گئیں

نامۂ فرقت شوق کی وہ ولولہ انگیزیاں
نامہ بر کے آتے آتے ایک آفت ڈھا گئیں

تمنے جو سطریں لکھی تھیں خط پہ تسکیں کیلئے
مجھ کو وہ جس وقت بھی یاد آ گئیں، تڑپا گئیں

کیا تصور تھا کہ میں تو رات بھر سمجھا کیا
جیسے کوئی کہہ رہا ہے کان میں "وہ آ گئیں"

اتفاقاً اڑ گئی تھیں تم نے آنکھیں اے ہدف
وہ نگاہیں کیا تھیں، ناوک تھیں جو دل برما گئیں

مجھسے لی جواب ...

میری تین خواہشیں

(از رفیظ سامع لکھنوی)

(مزاحیہ)

(۱)

میں فلک ازل سے زمین وجود پر یوں کودنے کے لئے تیار ہوا جس طرح کلکتہ کے گول تالاب میں ہاتھ پیر جوڑ کر بنگالی بابو کودنے کے ارادے سے کھڑے ہوتے ہیں۔ چلنے سے کچھ منٹ پہلے میرے دل میں تین خواہشیں اس طرح دھم سے گریں جیسے ہوائی جہاز سے بم، ابھی بس نہ پوچھئے پہلی خواہش کو جو نگاہوں کے پلوں میں رکھکر تولتا ہوں تو اتنی وزنی جیسے با تشبیہ رومی دروازہ

دوسری خواہش پر جو نظر ڈالی وہ اتنی وزنی تو نہ تھی مگر اسکا چوتھائی وزن ضرور تھا تیسری خواہش ان دونوں سے ہلکی تھی۔ پھر بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب دو خواہشوں کا اتنا اتنا وزن تھا تو تیسری لاکھ ہلکی ہوگی لاکھ ہلکی ہوگی جب بھی سوراج کے جہاز سے لنگر میں زیادہ ہی ہوگی۔

اچھا سنیئے! پہلی خواہش تو یہ تھی کہ جانے کے ساتھ ہی کسی ملک کی رعایا کو غافل دیکھتے ہی تخت سلطنت پر دھم سے کود بیٹھیں گے۔ یہ کریں گے۔ وہ کریں گے۔ یوں حکومت کریں گے ملک کو اس اس طرح شاہراہ ترقی پر لگائیں گے سب سے پہلے ایک کام کریں گے یعنی یورپ کی تفریح کریں گے ادھر جائیں گے اُدھر جائینگے۔ خوب چکنی چپڑی باتیں کرینگے۔ اپنی پیاری پیاری ملکہ کے لئے جتنا جواہرا خریدا جائے گا خریدیں گے جتنی قیمت کی بھی ممکن ہوسکیں گی عمدہ پوشاکیں بنوائیں گے۔ ہوائی جہاز مول لیں گے۔ دنیا کے سامان خریدیں گے۔ مگر سب کل کے وعدے پر قیمت دینے کا اس وقت وعدہ کریں گے جب گھر پہونچ جائیں گے جس وقت اس تفریح سے نئی تہذیب کے نمونے اپنے ملک میں لائیں گے تو سب سے پہلا کام مولویوں کو داڑھی مونچھ صفا چٹ کرا دینا دیں گے ملاؤں کی پگڑی ہیٹ سے اور جبا پائجامہ کوٹ پتلون سے بدل دینگے گھر پہنچتے ہی [illegible] جسطرح کھانا کھاتے وقت کتے کو دتکار دیتے ہیں۔ الغرض یہ کریں گے اور وہ کریں گے سب کچھ کریں گے۔

اتنی دیر میں ایک اور خیال پیدا ہوا کہ بھئی بادشاہ بنیں گے کیونکر؟ مگر فوراً ہی دل دیوانہ نے اس کا جواب [illegible] ابھی کچھ بھی مشکل نہیں جاتے ہی پہلے سائنس بھیجیں گے۔ اس کے بعد کچھ فوجی سپاہی [illegible] بھجائیں گے۔ [illegible] سپاہی کیسے [illegible] کی دو چار لاتیں کھا کر شہسواری کے فن میں بھی مشتاق ہو جائیں گے۔ اس کے بعد کچھ بھی مشکل نہیں [illegible] یا [illegible]

صبح کو ہم خود سپاہی ہو جائیں گے کسی فوجی افسر کے مرتے ہی فوج کے افسر اور افسر سے جرنیل بنجائیں گے پھر ترقی کی مشین چلاتے
چلاتے ایک دن وزارت کی کرسی پر قبضہ کرلیں گے۔ اب ہم سے اور تخت شاہی سے اتنا قرب ہو جائیگا۔ جتنا فاصلہ دل سے زبان
کا ہوتا ہے۔ بادشاہ صاحب ذرا بھی اونگھے اور ہم بادشاہ ہے جب بادشاہ ہو جائیں گے تو پھر نہ پوچھئے ابھی ندرات کو سوئیں گے دن
کو جاگیں گے۔ ان دونوں کے درمیان میں زندگی کی گاڑی چلائیں گے لیکن ایک خیال پھر پیدا ہوا ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی کمبخت بدبخت
نے بھی ہماری طرح ترقی کرلی۔ ہم یورپ کے ہوٹلوں میں رہے ادھر اس نے چمڑے کے سکے چلا دئے تو پھر کیا ہوگا۔ خیر ہوگا تو حال سوائے
خدا کے کوئی دوسرا جانتا ہی نہیں۔ ہم جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں۔ یہ زمانہ حال تمنائی بحث اثبات فعل خیالی ہے۔

(۲)

ابھی پھر خیال ہوا کہ شاید جناب کاتب اعمال صاحب اس بات میں ترمیم کردیں اور بجائے کسی ملک کا بادشاہ بنانے
کے چھوٹی سی زمین کا مالک یعنی کسی دیسی ریاست کا حکمراں بنادیں تو پھر؟ پھر بھی کچھ نہ پوچھئے افسوس ... جائیں گے والیٔ ریاست
کا خیال آتے ہی پھر فسانے کی کچی دیوار بنانے لگے۔ یہ کریں گے یہ ہوگا۔ وہ ہوگا۔ بس جاتے کے ساتھ ہی رعایا کو تو اپنی ایسی کی تیسی
کے حوالے کردیں گے۔ اور خود کیا کریں گے۔ ناچیں گے گائیں گے۔ دل کو نذر عشق کر دینگے۔ ایک بھولی بھولی۔ پیاری پیاری
بازاری دوشیزہ کی گردش نگاہ کے چکر کاٹیں گے جس وقت عشق کی چھینکیں آئیں گی تو دربار میں اعلان کریں گے کہ "ہے کوئی ایسا
جو تخت بلقیس کی طرح فلاں بیگم کو جلد سے جلد پہونچا دے فوراً ایک نمکخوار اس کام کو بھی بجالائے گا۔ اب نہ پوچھئے جس وقت وہ آجائیگی
تو دل کی آگ میں حسن کی ہوا لگنے سے عشق کی آنچیں اٹھیں گی۔ ایک کرور روپیہ کا محل بنوا دینگے۔ اگر کبھی کسی سیر تفریح کو جائیں گے
تو بارہ لاکھ روپیے کا جواہرات مول لائیں گے اور محل کے دروازے پر اگر کسی کمبخت کی زبان پر یہ فقرہ آگیا کہ بیگم صاحبہ کو رات سے
تین مرتبہ نزلہ ہو چکا ہے تو باہر ہی کے باہر ان جواہرات کو صدقہ کی بھٹی میں جلادیں گے۔

پھر خیال ہوا کہ رنڈی کبھی اور کسی زمانے میں گھسا دیکر عشق کی کمند میں پھنس کر بھاگ گئی اور کسی تاجر کے عشق میں
بولا گئی تو کیا ہوگا۔ ہوگا کیا؟ اپنے دس بارہ ملازموں کو موٹر پر سوار کرکے بھیجدیں گے کہ اس عاشق کو نامرادی کے گھاٹ جلد سے جلد
اُتار دو۔ یہ لوگ اس کا قلع قمع کرکے چلتے ہونگے۔ ہاں ایک بات کا خیال ضرور آتا ہے اگر کسی چھوٹے موٹے حکام نے بڑے صاحب تک
ٹیلیفون کا تار ہلادیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ وہ میاں بغیر گردن میں ہاتھ دئیے جان نہیں چھوڑیگا۔ مگر جناب جب دکھلی میں سر دیا
تو دھکوں کا کیا ڈر جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ دو حال سے خالی نہیں یا ریاست رہیگی یا جلے گی۔ اگر رہی تو تو فبہا۔ اور اگر دوبارہ کچھ ادھر
ریاست بھی گئی اور بیگم بھی گئیں تو سوائے یورپ کی سیر کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے ع
"مفلس ہاشبین گا یورپ مقام ہے"

نہ کچھ ملے گا نہ کچھ ملے گا جب بھی گذارا تو ضرور ہی ملے گا۔ وہی کیا کم ہے۔ وہاں کی ایک مفلس میم صاحب کو پھانس کر اپنا ہم مذہب بنا لیں گے اور بس۔

(۳)

ہاں جناب! انسان کا دماغ ہی تو ہے۔ شاید ادھر سے ادھر ہو جائے۔ اگر یہ دونوں نشانے خالی گئے یعنی سلطنت ملی نہ ریاست تو پھر کیا ہوگا، پھر ہوگا کیا تیری میری خوشامد کر کے "خان بہادر" تو ہو ہی جائیں گے۔ اور اگر یہ کرسی بھی خالی نہ ملی۔ تو ایک ڈنر دیکر انا ڑی (آنریری) مجسٹریٹی تو ضرور ہی مل جائے گی۔ اجی اس سے بھی گئے گذرے تو کسی شاہی وقف کے متولی ہی بن بیٹھیں گے اگر دیکھئے تو یہ بھی ایک بادشاہی کی قسم ہوتی ہے۔ دو چار ادھر ادھر کے افیونی پال لیں گے وہ ہم کو "پیر مرشد" کا لقب ضرور ہی دینگے ساڑھے تین آنے کا نخاس سے ایک گھوڑا اور دو سکنڈ ہینڈ کتے اونے پونے داموں پر خرید لیں گے اسی طرح ایک توڑے داری بندوق بھی مول لیں گے۔ مگر کتے ایسے مول لیں گے جو پانی سے مری مرغابی نکال لائیں۔ دن بھر تو شکار کھیلیں گے۔ دن تو اس طرح کٹے گا۔ اب رہی رات تو ایک دھاپی کے لیٹ رہیں گے بس یہی معلوم ہوگا کہ سب زراء اور امراء دربار میں حاضر ہیں میں دربار کر رہا ہوں جب کبھی مفلسی چھائے گی تو دو چار وقف کی مدیں ادھر کی ادھر کر دیں گے کام نکل جائیگا۔ اب رہا وقف چاہے رہے چاہے وقف کی طرح وہ بھی چلتا دھندا کرے مگر یہ سب کام استخارہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ حد ہے کہ ایک مالی نوکر رکھونگا تو اس وقت تک نہیں رکھوں گا۔ جب تک استخارہ واجب نہ آئے۔

مگر جناب۔ یہ تینوں نشانے مس ہو گئے۔ اب جو آنکھ کھلتی ہے تو میز پر کہنی ٹکائے فسانہ "امیری تین خواہشیں" لکھ رہے تھے۔

واقعہ

(از جناب بہزاد ذاخدری لکھنوی)

(اپنے نظارہ کے لئے)



مہربانی سے نہیں کم دلستانی آپ کی
ایک قلب داغ پرور ہے نشانی آپ کی

رہنے دیجئے رہنے دیجئے بس علاج داغ دل
دل مٹا کر ایک پائی ہے نشانی آپ کی

ہم سے اور امید نالہ! توبہ توبہ کیجئے
ہم کو تو ہر ہر ستم ہے مہربانی آپ کی

دیکھنے والے لٹا بیٹھے متاع عقل و ہوش
ایک کیف میکدہ ہے یا جوانی آپ کی

زندگی کیا چیز ہے اور موت کیا شے ہے مری
مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی

حضرت بہزاد ان کے سامنے چپ لگ گئی
کہئے کہئے کیا ہوئی جادو بیانی آپ کی

تحقیق جدید

(مسٹر "چھپے رستم" کے قلم سے)

ذیل میں چند الفاظ کے حقیقی معنوں کے علاوہ بعض ایسی باتوں کی تشریح کی جائیگی جو زبان و دماغ میں تو ہیں۔ مگر کسی مطبوعہ لغت میں نہیں۔

ولہ (اور بھی کے لئے) بڑا زبردست اور ہمہ گو شاعر گذرا ہے، ہر ایک مذاق اور ہر ایک رنگ میں اس کا کلام موجود ہے، دیوان مرتب نہ ہونے کی وجہ سے شعرا نے اپنے اپنے مذاق کے موافق ولہ کا کلام آپس میں تقسیم کرلیا، تقریبًا ہر ایک شاعر کے دیوان میں اسکے اشعار موجود ہیں۔ مگر حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے۔ کب پیدا ہوا، کب انتقال کیا، کہاں کا رہنے والا تھا، کس خاندان سے تھا کچھ معلوم نہیں بڑی کوشش اور تجسس کے بعد اتنا پتہ چلا ہے کہ "ولہ" شاعر کا تخلص تھا، نام کچھ اور ہوگا۔ شاید یقینًا ہو۔ غالب کے دیوان میں صرف ایک مقطع ملتا ہے۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو[1] کہ پھر نہ تھمتا　　　جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

کھیاں مستقل کوئی معنی نہیں، صرف دو لفظوں کی جمع میں "کھیاں" دکھائی دیتا ہے۔ ایک "کھی" سے "کم کھیاں" (مکھیاں) دوسرے "پنکھیا"[2] سے "پن کھیاں" (پنکھیاں)، اسکے بعد بعض جملوں میں زبردستی "کھیاں" نے اپنی جگہ نکالی جیسے "ان کھیاں" (انکھیاں) گو اس میں تاویل ہو سکتی ہے کہ "انکے یہاں" کثرت استعمال سے "انکھیاں" بنگیا مگر "انکے کھیاں" میں کیا کہا جائیگا۔ یہ اس میں ایک "کھے" کیونکر بڑھ گیا، یا اسی طرح سے "تمھارے کھیاں" "ہمارے کھیاں" پھر یہ بھی نہیں کہ جملہ کو بازاری کہکے جان بچائی جائے، ہم دیکھتے ہیں کہ عام، خاص، مطلق سب بولتے ہیں۔ اب اسکو غلط العام فصیح کہا جائے یا غلط العام فصیح،

حکیم (دانا، عاقل)، ماہر علوم، حکمت و فلسفہ کا زبردست عالم، علم الابدان کا فاضل، کسی علم میں یکتا، شاعر جید، طبیب، حافظ مفردات، عطائی، عطار، جو صرف نبض کی جگہ جانتا ہو، جو استاد کے بتلانے پر نسخے لکھتا ہو، جو گورغریباں کی آبادی میں اضافہ کرتا ہے، جو آلو بخارہ کو الو بیچارہ سمجھے۔

حضرت (پیشگاہ) لفظًا ہر ایک امام، پیغمبر، مولوی، مجتہد، نثار، شاعر، بادشاہ، وزیر، ہر ایک مالدار آدمی، جو کچھ لکھ لیتا ہو، جو کچھ کہہ لیتا ہو، ہر وہ شخص جسکا نام معلوم نہو۔

---

[1] مرزا غالب کا شعر ہے۔ رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا　　جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

[2] پنکھیا، پنکھے کی تصغیر ہے۔ چھوٹے پنکھے کو کہتے ہیں۔ پنکھیاں جمع ہے

خلیفہ۔ (بعد میں آنے والا) نائب خدا، جانشین پیغمبر، تمام مسلمانوں کا واحد پیشوا، ہر مسلمان بادشاہ، ہر سلطان دلی ملک، ہر مسلمان نائی۔

فیلسوف (فلسفہ کا زبردست ماہر) جید فلسفی، فلسفیانہ خیال کا شاعر، فلسفہ میں شُد بُد رکھنے والا (عورتوں کی اصلاح میں) مکار، چالاک، دغا باز۔

جناب (بارگاہ) تعظیماً، امام، پیغمبر، بادشاہ وزیر، رئیس، عہدیدار، ذی عزت، خصوصاً ہر ایک مولوی مجتہد اور عموماً ہر ایک ہندوستانی۔

محقق۔ (تحقیق کرنے والا) جسنے کوئی ایسی مدلل تصنیف انتہائی تحقیق کے بعد پیش کی ہو جسکی ایک ایک سطر پتھر کی لکیر ہوگئی ہو مسلمانوں میں دو شخص اسی لقب سے مشہور ہیں ایک ملا نصیر الدین محقق طوسی، واقعاً یہ ذات صحیح معنوں میں محقق ہی مشکل سے کوئی علم ایسا نکلیگا جس میں انکی تصنیف مستند موجود نہو اور فلسفہ اخلاق کے تو مکمل کرنے کا سہرا انھیں کے سر بندھا۔ دوسرے ملا جلال الدین محقق دوانی، بڑے عالم و فاضل تھے، گو محقق طوسی کے کمال کو نہ پہنچے لیکن پھر بھی دو تین کتابیں لکھنے کے بعد ضرورۃً محقق دوانی بنا دیے گئے اس سے غرض نہیں کہ وہ اپنی تصنیف میں خود محقق طوسی کی تصانیف سے مستفید ہونیکے مقر ہیں خیال تھا کہ اسکے بعد لفظ کی ترقی مسدود ہو گئی، مگر ایسا نہیں ہوا زمانہ کو باتحقیق محقق کی ضرورت محسوس ہوئی اور ہر ایک محقق بننے کا آرزومند ہوگیا جس سے لفظ کی وقعت گھٹی اور دلکی امنگ بڑھی نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان المحققین۔ ملک المحققین، رئیس المحققین، صدر المحققین، تاج المحققین، راس المحققین، محقق المحققین، بنے خدا جانے کون کون محققین پیدا ہوئے۔

مولانا (ملا میرے آقا، میرے مالک) امام، پیشوا، عربی کا عالم، بزرگ قوم، مذہبی کا مدرس، مسلمانوں کا لیڈر، عربی کا طالب علم، ریش اصیل جیسے مسلمانوں کے ڈاڑھی ہو، ہر ایک مسلمان ایڈیٹر ڈاڑھی ہو کہ نہو، ہر ایک ڈاڑھی کا مسلمان مضمون نگار، ہر ایک مسلمان ڈاڑھی منڈا شاعر۔

علامہ (زبردست عالم) عالم کامل جو تحقیقی مضامین لکھتا ہو جسکی شاعری دقیق اور گنجلک ہوتی ہو، جو اجرت پر اچھے مضامین لکھوا کے اپنے نام سے شایع کرتا ہو۔ (عورتوں کی اصطلاح میں) بدمعاش عورت، شریر عورت، جعلساز عورت۔

سید (سردار) رئیس قوم، بزرگ قبیلہ، آل رسولؐ، ہر ایک مسلمان فقیر۔

مومن۔ (ایمان والا) صاحب ایمان، مسلمان سے ایک درجہ بلند، ایک شاعر، ہر ایک مسلمان جولاہا۔

حافظ (یاد رکھنے والا) جسکو پورا قرآن یاد ہو۔ جسکو بہت سے سورے یاد ہوں، جسکو کثرت سے آیتیں یاد ہوں، جو اندھا ہو۔

شاعر۔ (شعر کہنے والا) علم عروض کا ماہر اور ہر ایک صنعت شاعری پر قادر، صرف خوش گو، فقط ناظم، تکیا، کہلوا کے مشاعرہ میں غزل پڑھنے والا۔

معشوق - (جسکا عشق ہو) دلپسند عورت، خوشرو مرد، ڈاڑھی مونچھوں والا جسکے زلفیں بھی ہوں، جو قبا اور چوڑیاں پہنتا ہو، جو دوپٹہ اوڑھے اور اس پر سے ٹوپی بھی پہنے، جو گھوڑے سواری بھی جانتا ہو جو تیر تلوار، نیزہ خنجر خوب چلاتا ہو جو عاشق کو اپنی محفل بلکہ گلی میں بھی دھسنے نہ دے، جو رقیبوں کے ساتھ مزہ کرے اور عاشق کو ترسائے، جو خنثائے شکل ہو۔

ابول "اب" عربی میں باپ کو کہتے ہیں، فاعلی حالت میں اب کیساتھ واؤ بڑھ جاتا ہے۔ اضافت کے بعد مضاف الیہ کا الف لام بھی ابو سے چپک کے "ابول" بنجاتا ہے۔ عربی میں یہ ابول کنیت کی علامت ہے جو بیٹے کے نام سے ہوتی ہے یا جس شخص میں جو صفت زیادہ پائی جائے اسے اس صفت کے ساتھ ابو کا اضافہ کر کے کنیت بنا لیتے تھے جیسے ابو تراب امیر المومنین حضرت علیؑ کی کنیت تھی اور ابو الفضل حضرت عباسؑ ابن علیؑ کی، عرب کنیت میں مماثلت ہونے سے احتیاط کرتے تھے تاکہ نام دو شخصوں کا ایک ہو تو کنیت سے امتیاز ہو جائے ہندوستان میں یہ خصوصیات سب غائب ہو گئے اور ابول لازمۂ علم و ادب قرار پایا یعنی جو ابول نہو وہ پورا ادیب نہیں اسلئے کوئی ابو الفضل بنا کوئی ابو الفضائل اور کوئی ابو الاعجاز بنا تو کوئی ابو الکشف یہانتک کہ اس ابول کے بہران میں بعض ذوات مقدسہ کی کنیت مختصہ او رحق تلفی کی بھی پروا نکی گئی ہمارے خیال سے پھر بھی کاہل حقیقت نمائی نہیں ہوتی ابھی امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کی کسر ہے۔

منشی - (لکھنے والا) انشا پرداز، زبردست اہل قلم، کلرک، عرائض نویس، محرر، کاتب، بہی کھاتہ لکھنے والا، ڈاکخانہ میں ٹاٹ پر بیٹھ کر اجرتی خط لکھنے والا۔

ادیب (علم ادب کا جاننے والا) اردو کا ادیب یعنی ہندوستانی ادیب۔ یو۔پی کا ادیب، جو نثر و نظم میں دخیل ہو، جو چوڑی دار گھٹنا اور شاندار شیروانی پہنتا ہو، اگر اس لباس پر ذکو ہیٹ اور شام کو ترکی ٹوپی پہنتا ہو تو پورا ادیب ہے۔ مگر عینک ضرور لگاتا ہو چاہے تال نگاہ کے برابر نہوں فاؤن ٹن پن بھی لازمۂ ادیب ہو چاہے بارہ ہی آنے کا ہو۔ اور اگر ان سب چیزوں کے ساتھ ایرانی ٹوپی پہنتا ہو تو آدھا ادیب ہے اور اگر رامپوری ٹوپی یا دوپلی پہنتا ہو تو صرف شاعر ہے نثار نہیں اور اگر دوپلی ٹوپی کے ساتھ انگرکھا بھی پہنتا ہو تو پھر شاعر ہونے میں بھی کلام ہے۔

ادب لطیف - وہ نظم و نثر جس میں انگریزی ترکیبوں کا ترجمہ کیا گیا ہو یا فارسی کی انوکھی ترکیبیں بنائی گئی ہوں، جو نہ اردو ہو نہ ہندی، نہ فارسی ہو نہ عربی، جس میں الفاظ کا معمہ ہو، بھول بھلیاں ہو۔ گورکھ دھندہ ہو۔ اور معنی لاپتہ جسم میں۔ بوسۂ رقصیدہ۔ تبسم عریاں، دوشیزۂ ہر شے، دنیائے ہر چیز، ذرات، ہر ہر نظر آتا ہو۔

مہتر (بلند مرتبہ بزرگ تر) حلال خور، جاروب کش، بھنگی،

کاش دنیا والے بر خود غلط خیال کو ترک کریں اور الفاظ کو محل صحیح میں صرف کیا کریں۔ وما علینا الا البلاغ

شام کا پہلا تارا

(از فضل لکھنوی)



یوں تو بس ہر وقت ہی رہتا ہے الفت کا اثر　　ہاں قریب شام جب ٹھہرا ذرا درد جگر
مٹ گئی تکلیف ساری ذکو جاتے دیکھکر　　اک چمکتے تارے پر آخر پڑی میری نظر

فکر تھی آغاز کی اور غم نہ تھا انجام کا
دل میں وہ اور سامنے تارا تھا پہلا شام کا

دن کا آخر ہے ورق اور رات کا پہلا ہے باب　　وقت دونوں مل رہے ہیں چھپ چکا ہے آفتاب
خون دل سے ملتا جلتا لال ہے رنگ سحاب　　نور کا چہرہ ہے اور ظلمت کی ہے ہلکی نقاب

نور و تاریکی کا ملجانا یہی اک قہر ہے
یہ وہ دو نقطے ہیں جنسے انقلاب دہر ہے

ہے غروب مہر کے ہنگام یہ نگب جہان　　ہے سیاہی اک طرف اور اک طرف سرخی عیان
یوں سیاہی بڑھ رہی ہے تیز زیر آسمان　　جس طرح بکھرے ہوئے بالوں کا ہو مجمع پریشان

مشرق و مغرب کے اب ملنے میں کیا تاخیر ہے

ایک آئینہ کی اک آئینہ میں تصویر ہے

یہ غروب مہر کا منظر جو دل کو بھا گیا　　جس کو دیکھا تھا ستارہ بھر نظر وہ آ گیا

کیا بتاؤں کیا خیال آیا جو دل تڑپا گیا　　وہ گھروندا تھا تصور کے جسکو ڈھا گیا

دل میں اب وہ خیال اور زندگی مشکل میں تھی

اک چمک تارے میں تھی اور ایک سے دل میں تھی

آ گیا جب اپنے مرکز پر تصور کا کمال　　اور مجازی سے حقیقت بن گیا دل کا خیال

دیدۂ باطن سے آخر دیکھا یہ حسن جمال　　سامنے کوئی کھڑا ہے دوش پر بکھرائے بال

کامیابی تھی تصور کی عجب مشکل میں تھا

سامنے موجود تھا جو کچھ کہ میرے دل میں تھا

سامنے صورت تھی سب کہے رہے تھے دل کے راز　　تھا کہاں یہ ہوش کر سکتا جو اتنا امتیاز

یہ خیالات پریشاں بن گئے ہیں سوز و ساز　　کھل گیا رنگ حقیقت اڑ گیا رنگ مجاز

وہ کہاں اور ہم کہاں یہ فضل وقتی بات تھی

بند آنکھیں جب کھلیں تو بھی خاصی رات تھی

(ماخوذ از "ریاست" دہلی)

بھابھی کی سرگذشت

(۵۷۱ کے قلم سے)

مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس رشتہ سے اونکی گھر والیاں بھابھیاں ہوئیں۔ جو سچ پوچھو تو یہہ بھابھیاں بہت چل نکلی ہیں۔ "سیکم سیکو پڑ وسن سیکو" کے اعتبار سے بھائی کو جو جنٹلمین بنتے دیکھا تو خود بھی لیڈیز بننے کی تیاری کر دی۔ بھائی نے ڈاڑھی مونچھوں کو نوچکر ایشیائی لعنت کو یورپین رحمت پر قربان کیا تو بھابھیوں نے زلفیں کتروا کر اس آشیانے ہی کو اوجاڑا جسمیں ہندوستانی بھائی کا طائر دل بسیرا لیا کرتا تھا۔ سب تو تھا ہی تھا۔ بھائی شرعی پیجامہ اچکن سے بیزار ہوئے تو بھابھیاں بھی ساری سے آزاد۔ بھائی کو شرم ملی و غیرت مذہبی سے بیباکی ہوئی اور بھابھی کو پردے سے۔

یہ آزادی اگر تعلیم کے بل بوتے پر ہوتی تو بھی ایک بات تھی (اگرچہ اپنی تہذیب و معاشرت کو غیروں کا کر دینا بہرحال لغو ہے) اگر پھر بھی خیر یہاں کھانے کے دانت اور ہیں دکھانے کے اور اُردو ہجے کر کے پڑھتی ہیں اور دیوان غالب پر شرحی مضامین تحریر ہوتے ہیں۔ یہ کیونکر بھائی لکھ دیتے ہیں اور بھابھی تعلم خود کا رسم پورا کر لیتی ہیں۔ پرانے حکما کے نزدیک خلا تھا محال۔ اب یہ خدا کی بندیاں پردہ سے باہر آنے کے لئے ساریاں باندھ رہی ہیں۔ تو غیرتمندان ملت کو پردہ میں جا بیٹھنے کے لئے کمر باندھنا چاہیئے تاکہ دونوں جانب خلا نہ رہے اور تصویر کے دونوں رخ سامنے آجائیں۔ اتنی اندرونی حالات پر یہ مسلسل بکواس شروع کی جارہی ہے اگر کسی بھابھی کے حالات سے مطابق ہو جائے تو ہماری اور ہمارے محلے والوں کی بلا سے کلنے والے مونڈی کاٹے ہمیشہ سے اول جلول ہوتے ہیں۔

(۱)

بھابھی کی شادی سارڈا ایکٹ کے نفاذ سے پہلے چودھواں برس بیٹ کا ڈالکر کر دی گئی تھی۔ اونکو میکے والوں سے بچھڑے ہوئے یہ پہلا ہی مہینہ تھا، اگرچہ اپنے کمرے میں کھاتی تھیں پیتی تھیں۔ کھیلتی تھیں۔ مگر مکان کے صحن میں جب نکلی تھیں تو ڈیڑھ فٹ لمبا گھونگھٹ آگے نکلا ہوا اور منتوں میتوں کرتی ہوئی۔

بھیا بچارے ایک دوکان پر حساب کتاب لکھنے پر پچیس روپیے کے نوکر تھے اور بھابھی کے باپ بھی بالکل بھیا کے ہموزن تھے مگر بھابھی نے شادی کے پہلے محلے کی شادی شدہ لڑکیوں سے دریافت کر کے اون تمام راحتوں کو لفظاً لفظاً پوچھ لیا تھا جو ماں باپ کے

پنجہ سے آزاد ہونیوالی لڑکی شوہر کی محبت سے حاصل ہوتی ہیں۔ بھابھی کی ایک ہجولی قسمت کی دھنی تھی وہ شادی سے پہلے ہی ساس سسروں کو چٹ کر چکی تھی اور اُس کے گھر میں اُسکے اور اُسکے شوہر کے سوا دوسرا نہ تھا۔ اسلئے وہ گویا خود مختار اسٹیٹ کی رانی تھی جو چاہتی وہ کرتی جو کہتی وہ ہوتا۔

بھابھی بھی گھر سے چلتے وقت اسی آزادی کی ہوا کو لئے ہوئے گھر میں آئیں تھیں اور اسی لئے رخصتی میں انکا جوش کا دو چار مرتبہ کی ہوں ہوں سے آگے نہ بڑھا تھا۔ بھابھی کو بھیا کرایہ کی فنس سے گود میں لیکر ہانپتے کانپتے اُنکے بستر تک لائے اور اگر بھیا کی بڑی بہن خورشید بیگم اور انکی والدہ سعیدہ بیگم صاحبہ درمیان میں جابجا سہارا نہ دیتیں تو بھابھی اور بھیا دونوں قلابازی کھا جاتے، اور بھابھی بہت قریب سے اُس زمین کو دیکھ لیتیں جسکی وہ مشتاق تھیں کیونکہ بھیا تو بچارے فکروں کے مارے سوکھے سہمے تھے اور بھابھی اگرچہ بلغمی مزاج نہ تھیں مگر پھر بھی بھیا سے دوگنی تھیں۔۔

اس کشاکش میں بھی بھابھی نے گھونگھٹ کی آڑ سے تھوڑی بہت آنکھیں کھولکر اوس گھر کو دیکھ ہی لیا جسمیں آیندہ طرز حکومت پڑنے والی تھی۔ اور اسی نقطۂ خیال کے ماتحت چننے والان کمرے کوٹھریاں اذکو نظر آسکیں اونکی ترمیمی اسکیم پر غور کرنے لگیں رسم معنوں کی گھما گھمی بچوں کی جنتیں سے دیکھنے والیوں کا شوق رسموں کا ہنگامہ انتظامیوں کے شور سے مکان چھوٹی قیامت کا نمونہ تھا ماماکیں دوڑ رہی تھیں بچے ہر دور میں کھڑے رو رہے تھے مگر دلہن بیوی کو سب کچھ فراموش تھا۔

بھابھی پر سکوت فرض تھا آنکھوں کا بند ہونا لازم تھا۔ انسان کی فطرت ہے آنکھیں بند ہونے سے غور و فکر کی مشینری تیز چلنے لگتی ہے بھابھی حکماً آنکھیں بند کئے منہ پر مہندی بھرا ہاتھ رکھے تھیں۔ وہ کچھ اس دنیا سے باہر تو چلی نہیں گئیں تھیں۔ اگر وہ یہ سارا وقت غور و فکر میں نہ گذارتیں تو اور کیا کرتیں۔ وہ سوچ رہی تھیں۔

صدر کمرہ جو ساس سسروں کا نشیمن تھا) اندھیرا ہے اس میں تین روشندان ضرور بنواؤں گی اور روشندانوں میں ریشمی سرخ پردے بھی ہونگے۔ آگے کے دالان میں چوتھائی حصہ میں تخت کا چوکہ ضروری ہے۔ مگر ٹرے تخت تو یہاں دکھائی بھی نہیں دیتے ادھر اودن سے کہونگی اور منگاؤں گی۔۔۔۔۔۔ مگر وہ کیسے ہیں اذکو ابھی پوری طرح تو دیکھا ہی نہیں۔ کچھ سٹر بلے مزور ہیں۔ فنس سے اس طرح اتار اکہ گوڑا آنچل کا لچکا کیل میں پھنسکر ادھڑ گیا۔

اچھا تو یہ پہلو کا کمرہ (بھیا کی چھوٹی بہن اختری بیگم کا مسکن) یہ صحن کی جانب بہت بڑھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اندر سے چوڑائی زیادہ ہے۔ پھوپھی اماں کے گھر میں بھی ایسا ہی کمرا تھا۔ اسکو کھد وادینا بہتر ہے۔ بھلا باورچی خانے کے دالان کی کیا ضرورت۔ ایک سامان ایک بی بی صحن میں کہیں پر چولھا بنالی اور کھچڑی پکالی جب للّو کے گڈے سے گڑیا کی شادی ہوئی تھی۔ اوسوقت دس گڑیوں کا کھانا میری چھوٹی سی چولھیا پر پک گیا۔ اس دالان کی دو صحنچیاں ہو جانا چاہیئے۔ ایک میں ڈھنڈر کا سامان رکھا جائے دوسرے میں گڑیونکا۔ گھر دندا۔ واہ کیا میں اپنی

گڑیاں گھر ہی پر چھوڑ دوں گی۔ بی حجن نے جو گڈا دیا ہے کیسا بانکا ہے۔ منی سی ڈبیا کیسی خوبصورت ہے میرے پردار گھوڑے کے لئے بھوبھا ایا کیتے تھے کہ حضرت ام المومنین کے پاس بھی اس طرح کا تھا۔ اور انھوں نے بھی شادی کے بعد سسرال میں گڑیاں کھیلی تھیں

ادھر بھابھی اپنے حکومت کی طرح اندازی میں مصروف تھیں اور ادھر مہمان سعیدہ بیگم صاحبہ کو مبارکباد دینے میں ہیشہ دمی کر رہے تھے سب سے پہلے بی حجن نے کہا لو دلہن (سعیدہ بیگم) مبارک ہو اللہ نے تم کو اکیلے سے دوکیلا کیا۔ ابھی بچہ ہے کچی لکڑی ہے جس طرح چاہو گی مڑ جائے گی۔ سال دو برس میں گھر سنبھال لے گی۔ مگر ذرا دباؤ میں رکھنا۔

سعیدہ بیگم ہاں اب ہی سب کی دعا سے اللہ نے یہ دن دکھایا مجھ گنہگار کا منہ تو اس قابل نہ تھا۔ انشاء اللہ میرے ساتھ رہکر دولہن سب سیکھ جائیگی میں ان عورتوں میں نہیں ہوں جو بہو بیٹی کو ہواؤں پر چھوڑ دیں۔

بھابھی اپنی حکومت کی فکر میں اتنا گہرا غوطہ لگا چکی تھیں کہ انھوں نے یہ گفتگو سنی بھی نہیں۔ اور یہ خیال بھی نہ کیا کہ اس گھر میں وہ ایک محکوم کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھ سکتیں اور میکے سے سسرال میں صرف ویسا ہی تبادلہ ہوا جیسا بی کلاس سے سی کلاس میں سیاسی قیدی بھیجے جاتے ہیں۔

سعیدہ بیگم نے حجن بی کے سوا اس قسم کی گفتگو کبھی نہ کی تھی اور اب ایک ماہ اس شادی کو گذر چکا تھا اور بھابھی کے حکومتی منصوبے بندھ چکے تھے۔ گویا بجٹ تیار تھا عملدرآمد میں تاخیر تھی۔ سعیدہ بیگم نے نئی نویلی بہو پر فوراً حکومت کرنا اخلاقاً صحیح نہ جانا تھا اور ابھی وہ اپنی بہو کے ساتھ، ویسا سلوک کر رہی تھیں جیسے ایک مہمان کے ساتھ برتا جاتا ہے بیچاری کے میاں (سلطان احمد) کسی وکیل کے محرر تھے انکو دس بجے کچہری پہونچ جانا اور ۶ بجے شام کو بستہ دبا کر گھر میں واپس آنا تھا۔ نماز کے بعد کھانے سے فرصت کرنا اور سو جانا جو کچھ ہاتھ پاؤں ہلا کر پیدا کرتے تھے وہ سب سعیدہ بیگم کے ہاتھ میں دیدیتے تھے گھر کے کام کاج سے مطلب نہ تھا۔ سعیدہ بیگم ایک سگھڑ اور سلیقہ والی بی بی تھی جبتک میاں کا پیالہ پتیلی سے پہلے نہ نکل لے اسوقت تک وہ نمک چکھنا بھی گناہ جانتی تھی وہ مہینوں اپنا دل مارتی اور گھی کی بو نہ سونگھتی مگر میاں کے آگے دو چپڑی روٹیاں ضرور رکھتی۔

گھر کا سودا سلف میاں کلو لاتے جو محلہ بھر سے اپنی اس خدمت میں ٹیکس وصول کرنے کے عادی تھے سعیدہ بیگم نے بہو کے ساتھ خلاف قاعدہ یہ عمل مہینہ سے زیادہ جاری رکھا گھر میں دن کو دال اور شام کو سالن پکا کرتا تھا مگر بہو کے لئے بیچاری ایک ترکاری ضرور بھون لیتی تھی۔ گھر میں مرغیاں پلی ہوئی تھیں ایک انڈا ضرور تل دیتی تھی وہ پوریاں یا دو پراٹھے بھی روٹیوں کے ساتھ ہوتے تھے سعیدہ بیگم نے اس تمام خرچ کا بجٹ شادی کی رقم سے پورا کیا۔ مگر اب شادی کا چالیسواں ہو چکا تو بیچاری نے پہلے ہی روز بسم اللہ کہکر صبح کو دال روٹی بہو کے سامنے رکھی۔ بھابھی نے ارہر کی دال پر نظر ڈالی اور فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی ہے جو میکے میں دونوں وقت حاضر ہوتی رہتی تھی۔ تو میکے کی بات اور تھی، ابا کی کمائی تھی میں قید تھی۔ قیدیوں کو ایسی ہی چیز ملنا چاہیئے۔ اب یہ میری حکومت

کمائی کوئی خالی سسرے کی تو ہے نہیں اللہ رکھے میرے میاں پچیس روپیہ مہینہ میں لاتے ہیں بھر دال کھائے مری بلا مگر نیا نیا معاملہ ابھی پوری شرم گئی بھی نہ تھی۔ اس لئے بطور پر امن پکٹنگ بھابھی نے صبح کا کھانا ہی نہ کھایا۔ اور جب اختری بیگم نے پوچھا تو منہ بنا کر چپ ہو گئیں۔ سیدہ بیگم سمجھیں کہ رات کی غذا ہضم نہیں ہوئی ہے اسلئے بہو نے کھانا نہیں کھایا طاق پر سے چورن کی شیشی اوٹھا بہو کے کمرے میں آئیں۔ اے دلہن کیسی ہو خدا نہ کرے پیٹ میں درد تو نہیں ہے۔ میں تم لوگوں کے معدوں کا خود ہی خیال کرتی ہوں کوئی بادی ترکاری نہیں پکاتی۔ اے یونہی کچھ ریاح پیدا ہو گئے ہونگے۔ تو یہ چورن کھا لو۔ بیٹی بڑا اچھا چورن ہے چاروں نمک بھی اس میں ہیں۔ کالا نمک ذرا زیادہ ہے۔ باقی سب ہموزن ہیں۔

بھابھی کو پہلے تو غصہ آیا کہ لو ہمکو بڑی بی بیمار سمجھتی ہیں۔ نوج درگور میرا معدہ ایسا کیوں ہونے لگا کہ کھانا ہضم نہ ہو۔ مگر پہلے پہل کا معاملہ تھا اسلئے سر جھکا لیا سیدہ بیگم نے شیشی میں سے چورن نکال کر پڑیا بنا دی۔ بھابھی نے پڑیا لیکر پاندان میں رکھ لی ساس سمجھیں کہ میرے سامنے کھاتے شرماتی ہیں اوٹھکر چلی گئیں۔

دن بھر تو پیٹ پکڑے پکڑے گذری چار بجے سیدہ بیگم نے پکار کر کہا اے دلہن تمھارے سسرے کے آنے کا وقت قریب ہے بیٹا میرے بعد تمھیں کو گھر سنبھالنا ہے اختری جوان ہو چکی کچھ دن کی مہمان ہے پھر اپنے گھر بار کی ہو جائے گی بیٹا اپنے سسرے کا بھی خیال کر لیا کرو۔ وہ بھی خوش ہونگے کہ اللہ نے یہ دن دکھایا کہ بہو پان بنا کے رکھتی ہے بھابھی کا پیٹ کھرچ رہا تھا مگر کیا کرتیں۔ ابھی پاندان کھولا۔ بھابھی کا پاندان کیا تھا عمر عیار کی زنبیل تھی بالیوں کے موتی، دیسی لین کی شیشی، انگوٹھیاں چھلے مسی کی ڈبیا، رنگ کی پڑیاں۔ چونکہ بہو بھی ابھی تک تمباکو خود نہ کھاتی تھیں اور بھیا کو عادت تھی۔ اسلئے الگ پڑیا میں تمباکو بھی رکھی تھی، بھابھی نے پان بنائے گلوری موڑنا تو آتی نہ تھی۔ بیڑے بنائے اور تمباکو کے بجائے ہاضم چورن کی چٹکی چٹکی ڈال ڈبیا میں بند کر اختری کو اشارے سے بلا سر کی ٹالی

سیدہ بیگم چولھے کے پاس بیٹھی، اختری کو پڑھاتی جاتی تھیں۔ اور آٹا بھی گوندہ رہی تھیں۔ اختری جیسے ہی اوٹھی سیدہ نے پوچھا ابھی سبق تو یاد نہیں ہوا کہاں چلیں۔ اختری نے کہا بھابھی جان بلا رہی ہیں یہ کہکر لپک گئی اور پان کی ڈبیا باپ کے بستر کے سرہانے رکھکر پھر آ بیٹھی اور پڑھنے لگی سیدہ بیگم جی ہی جی میں بہت خوش ہوئیں اتنے میں سلطان احمد آئے اتفاق سے اونکے ساتھ ایک نئے موکل بھی ہمزادوں کی طرح ساتھ تھے یہ کسی راجہ کے مختار عام تھے سلطان احمد نے بستہ طاق پر رکھکر ادھر ادھر دیکھا اور ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیا دوسرے ہاتھ میں مونڈھا لئے ڈیوڑھی میں آئے اور مختار صاحب کو مونڈھے پر بیٹھا کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے مختار صاحب نے ڈبیا کھولی پان نکالا کھا گئے پان پر دانت لگتے ہی کالے نمک کی بو اور نمک کا ذائقہ معلوم ہوا مختار صاحب نے ہنسکر کہا کیا آپ کے گھر میں معدے کی شکایت زیادہ ہے۔ ہاں بھائی کچہری کی کمائی ہے مشکل سے ہضم ہوتی ہوگی۔

بیچارے سلطان احمد کچھ نہ سمجھے بغلیں جھانکنے لگے۔ مختار صاحب نے پان تھوک دیا۔ اب سلطان احمد سر ہوئے کہنے لگے کہ مختار صاحب

کہا پانوں میں کچھ تھا۔ مختار صاحب نے فرمایا کچھ نہیں فقط ہاضم چورن ہے۔

سلطان احمد کو یقین نہ آیا۔ دوسرا پان خود کھایا۔ بیچارے تھے متوسط درجے کے آدمی۔ مگر بردباری اُنکی محلے میں مشہور تھی وہ بلا تکلفی کو بڑا گناہ جانتے تھے وہ سمجھے کہ سعیدہ بیگم نے چورن ملایا ہوگا اور بغیر ہاتھ دھوئے پان بنائے گئے ہونگے انھوں نے تیسرا پان کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہاتھ لگا نہیں ہے بلکہ چٹکی بھر نمک پڑا ہے سونف کے ریزے جو تھے وہ نمایاں ہیں اب انکو خیال ہوا کہ سعیدہ بیگم نے خلاف عادت مذاق کیا۔ لیکن یہ مذاق کیا جب مجھے پانوں کی ڈبیا لیکر نکلتے دیکھا تھا تو کیوں نہ بتا دیا۔ مختار صاحب تو چلے گئے۔ سلطان احمد گھر میں آکے بی وی سے پوچھا۔ بی وی کو حیرت ہوئی۔ وہ کہنے لگیں کہ دولہن نے پان بنائے تھے۔ سلطان احمد سر جھکا کر چپ ہوگئے۔ مگر بھابھی کی یہ پہلی غلطی تھی جو سسرال میں ناقابل گرفت سمجھی گئی۔ (باقی آئندہ)

رنگ تغزل

(از جناب ہلال رامپوری)

یہ نہ سمجھو کہ نہ تھی دل میں تمنا کوئی ۔۔۔ جب مرے حال کا پرساں بھی تو ہوتا کوئی

مجھ میں اب تاب نہیں ضبطِ غمِ فرقت کی ۔۔۔ دیکھ لے دیکھ ہوا جاتا ہے رسوا کوئی

خون کا قطرہ نہ رہا قلب و جگر میں باقی ۔۔۔ اسقدر آج تری یاد میں رویا کوئی

حاصلِ کشمکشِ زیست تو بنجائے مگر ۔۔۔ تم جو بڑھ جائیں تو ہو جائیگا رسوا کوئی

دیکھ لے آخری ہچکی مری شاہد رہنا ۔۔۔ لے گیا چھین کے مجھ سے مری دنیا کوئی

جسکو آئے نہ کبھی اہلِ تمنا کا خیال
کیوں ہلال اسکی کرے دل میں تمنا کوئی

شاہی سُراغرسان

آخری تاجدار اودھ کے زمانے کا ایک سچا قِصّہ

از ڈاکٹر السید نادم حسنار رضوی ناظر ہو سیتاپوری

جرنلسٹ

حضور کی سلامتی . . . . دولت و اقبال کی بڑھتی ہو

حضور جانعالم واجد علی شاہ مرحوم شاہ اودھ بعد فراغت نماز جمعہ فنس پر چلے جا رہے ہیں۔ چاروں طرف اہل دربار حلقہ کئے ہیں۔ سینکڑوں مرد و عورت اپنے نیک دل محبوب بادشاہ کے دیدار کے مشتاق نظر آ رہے ہیں۔ سڑک کے دونوں کناروں پر فقیروں مسکینوں یتیموں بیواؤں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ ہزاروں روپیہ خیرات ہو رہے ہیں۔ سڑک سے کچھ دور نکل کر خلاف معمول ایک ادھیڑ عمر عورت جو نہایت کریہ المنظر نابینا اور بد صورت تھی گود میں ایک مہینہ کا بھی نہیں کچھ دنوں کا بچہ دبائے لوریاں دے دیکر بہلا رہی تھی جیسے جانعالم کی سواری نزدیک پہونچی تو اُسنے بھی آہٹ سنکر عام فقیروں کی طرح دعائیں دینا شروع کر دیں۔

حضور کی سلامتی ، دولت و اقبال کی بڑھتی ہو

اس عجیب و غریب انداز میں اس فقرہ کو کہکر جانعالم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ بادشاہ نے اس عورت کو دیکھ کر لوگوں سے پوچھا۔ کیوں! کیا یہ لڑکا اسی کا ہے؟ مصاحبوں نے جواب دیا۔ جہاں پناہ یہ اسی اندھی بڑھیا کا لڑکا ہے اسکے پیدا ہوئے ابھی دو ہی چار روز ہوئے ہیں۔ یہ سنکر جانعالم سرتاپا غرق تحیر ہو گئے۔ انکو تعجب تھا کہ کیا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جنکی نظر انتخاب اس بد صورت کریہ المنظر اور بوڑھی عورت پر پڑ سکتی ہے انھیں خیالات میں غلطاں و پیچاں بادشاہ محل میں پہونچ گیا۔ اور مزید تحقیقات بھی کر لی کہ اسکا کوئی شوہر نہیں ہے۔

علی رضا خاں کوتوال شہر کوئی معمولی ہستی نہیں تھی کم از کم اودھ کے امن و امان اور پولس کے نظم و نسق میں اُسے اتنا ہی دخل تھا جتنا کہ ایک کوتوال شہر کو ہونا چاہیئے۔ اس واقعہ کو دیکھکر بادشاہ نے فوراً علی رضا خاں کوتوال شہر کو طلب کیا اور نہایت سخت لہجہ میں کہا کہ تعجب ہے کہ علی رضا خاں کے زمانہ میں یہ قیامت بپا ہو جسکے وقت میں ساری ساری راتوں شہر کے دروازے کھلے پڑے رہنا کوئی بات ہی نہیں۔ بہت جلد اسکا پتہ لگاؤ۔ ورنہ گردن ماردی جاویگی۔ آٹھ دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ یہ سنکر

علی رضا خاں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ حواس باختہ ہو گئے اور سوچنے لگے کہ یا الٰہی میں کیسے اسکا پتہ لگاؤں کچھ سمجھ میں نہیں آتا خدا۔ نہ عزت و آبرو اور جان تیری امان میں ہو۔ یا امام رضا علیہ السلام علی رضا پر اپنا سایہ رکھئے۔ غرض حیران و پریشان اِدھر اُدھر گلیوں گلیوں کی خاک چھانتے رہے کہ شاید کچھ سراغ مل جاوے۔ بڑھیا سے پوچھا۔ اس نے کہا میں اندھی عورت ہوں مجھے کچھ نہیں معلوم کوئی صورت اطمینان کی نظر نہ آئی بلکہ دن بدن پریشانیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

ساون بھادوں کا لطف جو اودھ میں کسی زمانہ میں تھا دنیا کے کسی خطہ میں وہ بات نہ تھی۔ آج جمعہ کا دن ہے سہ پہر کا وقت آچکا ہے۔ سارا دن آفتاب منھ چھپائے رہا۔ بارش کی شدت رہی ابھی تک یہی حالت ہے پانی کی ہلکی ہلکی بھوار پڑ رہی ہے۔ بادل نہایت سیاہ سیاہ امڈ رہے ہیں۔ کوئلوں کی کوک اور پپیہوں کا شور رجالعالم کا زمانہ اُف قیامت اسوقت چھتر منزل کی بہار بس اپنی قسمت دنیا میں ساجنت کا لطف ہو۔

آٹھ دن کون بہت بڑا زمانہ تھا جمعہ جمعہ آٹھ دن ہو گئے ہاں چند گھنٹہ باقی ہیں علی رضا خاں کی موت کا وقت آرہا ہے اب کوتوال شہر کی گردن ماری جائیگی۔ لیکن علی رضا خاں کا ہمت و استقلال قابل تعریف ہو علی رضا خاں ایک گلی میں چلے جا رہے ہیں پانی زوروں میں برسنے لگا وہیں آگے بڑھکر ایک سائبان کے نیچے کھڑے ہو گئے کہ پانی تھم جائے تو باہر نکلیں۔ وہاں اور بھی کئی اجنبی کھڑے تھے۔ جنمیں سے ایک نواب صاحب نے جیب سے بٹوا نکالا اور ڈلی و تنباکو کھا کر کتھا کھایا لیکن چونکہ چونہ سوکھ گیا تھا۔ اپنے چپ کی ڈبیا تو اسی سائبان کے پرنالے کے نیچے کر دیا جس سے اس میں پانی بھر گیا اور نواب صاحب نے نوش فرما لیا۔ علی رضا خاں کوتوال کی ذہنیت اسوقت بالکل سراسیماں نیوٹن کی سی ہو گئی تھی انھیں اسکا بھی کھوج پڑ گیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا لیکن بہت ہی جلد انکو اسکا فیصلہ کرنا پڑا کہ طبیعت کی عفونت اور گندگی اسی کا نام ہو اور ایسی ہی طبیعتیں ایسے نیچ اور گندے حرکات کی مرتکب ہوتی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اس گندے نواب نے اس بڑھیا پر سنایت کی ہو —— خیال ہی نہیں بلکہ انکی گندی طبیعت سے مجھکو یقین ہے کہ یہی شخص ہے کہ جسکا لڑکا بڑھیا کی گود میں تھا۔ اس اچانک اور یقین آمیز خیال نے علی رضا خان کو اسپر مجبور کر دیا کہ وہ انکو گرفتار کرلے ——

علی رضا خاں نے نواب کو گرفتار کر لیا اور ساتھ لے آئے۔

گندے نواب کو حوالات میں مقید کر کے علی رضا خاں فوراً بڑھیا کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ اسکی شکل و شباہت کے متعلق کچھ بتا سکتی ہے۔ لیکن اس نے بینائی کا عذر کیا کہ آواز سے شناخت کر سکتی ہوں علی رضا خاں نے فوراً تلنگا بھیجکر نواب صاحب کو بلوا لیا کہا آپ اس بڑھیا کو جانتے ہیں۔ انھوں نے دبی آواز میں انکار کیا۔ بڑھیا نے آواز سنتے ہی کہا کہ ہاں یہی تھے۔ اب کیا تھا

علی رضا خاں کو اپنی عظیم الشان کامیابی پر جسقدر مسرت تھی ہو تھوڑی ہے۔ نواب کو کوتوالی لے آئے اور بڑھیا کو بلوا بھیجا اور اوس کے آنے پر اس سے کہا کہ آج جانعالم کے سامنے تجھے کہنا پڑیگا۔ وہ راضی ہو گئی اور شام تک ٹھہر کر دربار میں حاضر ہونے کا حکم دے کر چلے آئے۔

شام کو جان عالم جب مقربین خاص میں تشریف لائے تو حسب الحکم اونکو بڑھیا کا قصہ یاد دلایا گیا اور کوتوال کی حاضری کا حکم دیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد علی رضا خاں معہ بڑھیا اور نواب صاحب کے حاضر دربار ہوئے۔ نواب صاحب کو باہر ٹھہرا کر شرف باریابی حاصل کیا اور جانعالم کے سامنے حاضر ہوئے بادشاہ نے پوچھا کہو علی رضا خاں کچھ سراغ ملا علی رضا خاں نے جواب دیا کہ حضور کے اقبال سے پتہ لگا لیا۔ اگر حکم ہو تو حاضر کروں۔ بادشاہ کے حکم کے موافق نواب اور بڑھیا حاضر کئے گئے اور بڑھیا کے بیانات لینے پر معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے اسے کچھ دیا بھی تھا۔ بادشاہ نے نواب کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ کہو بڑھیا سچ کہتی ہے۔ نواب کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں اور صداقت کو فتح ہوئی۔

بادشاہ نے انھیں نہایت غیرت دلائی اور اس بچہ کو انکے سپرد کر کے اوس کی پرورش و تعلیم وغیرہ کا حکم دیا۔ پھر علی رضا خاں کی طرف مخاطب ہو کر دریافت کیا کہ تم نے انکا سراغ کیونکر لگایا۔ کوتوال نے سارا قصہ کہہ سنایا جسکو سنکر بادشاہ اُسکے عجیب و غریب ذہینت سے بے انتہا خوش ہوا اور بہت کچھ انعام و اکرام اور خلعت عنایت کیا۔

یہ تھا ایک عاقل حکمران اودھ کے زمانہ کا معمولی چٹکلہ۔

مرحوم دوست سے!

(از جناب محمود احسن صاحب نبوری)

مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانے والے! آہ! تجھے کیا معلوم کہ تیری ناقابل برداشت جدائی میرے لئے کسقدر روح فرسا ہوئی ہے۔ تجھے گذرے ہوئے مدتیں ہو گئیں لیکن تیرا غم منانیوالا اب اتنا ہی اشکبار اور بیقرار ہے۔ ظاہر پرست دنیا تو بیدرد ہے۔ اسکی ذہنیت قابل تضحیک ہے۔ اسکے طرز عمل کی تقلید اس "دیوانۂ الفت" کے لئے محال۔ ادھر کوئی فنا ہونے والی ہستی اس دنیا سے اٹھی اور وقتی جوش وخروش کی وہ فراوانی ہوتی ہے گویا مرنیوالے کا غم ہمیشہ یوں ہی منایا جائیگا۔ کوئی اسکی موت "اوقت موت" بتلاتا ہے۔ کوئی اوسکے دار ناپائدار سے گذر جانے کو "قومی ماتم" سے تعبیر کرتا ہے۔ کسی کی رائے زریں ہوتی ہے کہ "اسکی تلافی نہ ہوسکیگی۔ بیشک ایک ممتاز ہستی اوٹھ گئی۔ اخبارات کے کالم کے کالم چند دنوں تک مرنیوالے کے نوحۂ غم سے سیاہ کردیئے جاتے ہیں۔ اسکے علمی کارنامے مختلف رسالوں میں سراہے جاتے ہیں۔ پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہو۔ کوئی روشن خیال اس امر کا محرک ہوتا ہے کہ اوس کے علمی مضامین عالمانہ سطرے اسکی تالیفات وتصنیفات جلد سے جلد مدون اور مرتب ہو مستقل یادگار قایم ہو غرضکہ سب کچھ ہوتا ہے اور اوس کے بعد کچھ بھی نہیں۔ یادگار قائم کرنا تو درکنار۔ نام بھی بھولکر نہیں لیا جاتا اور کیوں لیا جائے۔ ممتاز ہستی اب معدوم ہستی ہو۔ یہ تو محض دنیا والوں پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کے لئے۔ اپنی روشن خیالی کا ثبوت دینے کے لئے مرنیوالے کے متعلق اخبارات ورسائل میں اتنا بھی لکھ مارا۔ یہی کیا کم کیا۔

میرے دوست! کہنا کیا تھا اور کیا کہہ گیا حقیقت تو یہ ہے کہ محبت کے زخمیوں کے احساسات پرہوتے ہیں۔ میں تجھ سے ایسے لوگوں کی شکایت نہ کرتا۔ اگر ان بیدردوں نے اپنے خشک فلسفہ اور اپنی نام نہاد ہمدردی سے میرے زخموں پر نمک چھڑکا ہوتا۔ میں تسلیم کرتا ہوں یہ سب اس لئے کیا گیا کہ تیری ناگوار جدائی میں میری غمگین فضا مبدل بہ مسرت ہو جائے۔ لیکن یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ تجھے بھولجانے کے لئے مجھے یوں سبق پڑھایا جائے۔ کارخانۂ عالم یوں ہی ہمیشہ سے جاری ہے۔ کوئی رہے یا چلا جائے۔ دنیا کا رنگین اجتماع کم نہیں ہوتا کیوں مصروف نیوں ہو۔ خیال تو کرو زندگی کے بکھیڑے ہی کیا کم ہوتے ہیں۔ فکر دنیا۔ فکر عاقبت اور پھر ان دونوں کے تحت ہزاروں جھمیلے۔ آخر اسکا علاج بھی تو ہونا چاہیئے تھا۔ مرنیوالا کشمکش زمانہ سے آزاد ہوا۔ اسیر رنج ومحن اس خرابہ سے جلد چلا گیا اور اچھا گیا۔ شکوہ بیکار۔ رنج وغم عبث۔ اب اُسے ہمدم اور رفیق کہکر اپنے اس عشق فطرت نفس کو ہلاک نہ کر۔ ان الفاظ کا محل استعمال غلط ہو۔ رفیق ہو یا مونس۔ محترم ہو یا معظم یہ سب ظاہری الفاظ ہیں جنکا اطلاق زندگی کے دم واپسیں تک ہوتا ہو اور بس۔

میرے محبوب! بارہا خیال ہوا کہ ان مفروضہ ہمدردوں سے پوچھوں اگر دنیا فانی ہو تو کیا اور اسکے ساتھ یہ بھی شرط ہو کہ اسکے رہنے والے بےمروت ہوں، ظلم پسند ہوں۔ لیکن نہیں میں نے دیکھا کہ خموشی ہی میں مضر ہو، کہیں اپنا زنانہ خفا نہ ہو جائیں۔ اور "مردہ پسند" کا خطاب دیکر میرے اس مجبور دل کو زیادہ صدمہ پہونچائیں۔ جب داستان غم سنانے میں یہ تلخ اور ناگوار نصیحتیں سننا پڑیں تو میں نے طے کر لیا کہ اب خموشی ہی میں بہتری ہے تیری دلداری محبت و دلجوئی کا افسانہ نہ کہوں واردات محبت کی ذرا ذرا سی تفصیلات سنا کر ان نازک مزاجوں کی بیجا سمع خراشی نہ کروں۔ ہاں میں نے اپنا انداز غم تبدیل کرنے کا ارادہ کیا خواہ مجھ ایسے خود رفتہ کے لئے ضبط الفت کتنا ہی دشوار کیوں نہو۔ میں ان کی موجودگی میں اب آہ و زاری کروں میں تجھے اوسوقت جی بھر کر سناؤں جب میری گریہ و زاری کا کوئی نگراں نہو۔ کوئی منع کرنے والا نہو۔ کائنات پر عالم سناٹا چھایا ہو۔ سونے والے مست و بےخبر ہوں۔ سامعت واہمہ میں جاذب اور بصارت عالم خیال میں محدود ہو۔

اپنا درد دل کس سے کہو۔ زمانہ والے آمادۂ جور ہیں۔ اب تک اگر مجھے داستان غم سنانے سے منع کیا جاتا تھا۔ اب میری خموشی پر طرح طرح کے حاشیئے چڑھائے گئے طے کیا گیا کہ اس افسردہ دل کو تنہا نہ چھوڑا جائے۔ اسکے حرکات و سکنات کی کافی نگرانی کی جائے۔ اسے خاموش نہ رہنے دیا جائے۔ مختلف مناظر دکھلائے جائیں۔ تفریح کرائی جائے تاکہ طبیعت کا رجحان بدل جائے آہ! میرے چاہنے والے کتنا اچھا علاج تجویز ہوا۔ کیا کہوں تجھ سے کہ انکی اس ناگوار تشخیص سے مجھ سوختہ جگر کو کتنا صدمہ پہونچا۔ آہ میرے لئے میرا درد ہی کامل شفا ہے۔

آخر مجھے لب ساحل لیجا کر پہونچا ہی دیا۔ ذرا دیکھ تو سہی تیرے اس دردرسیدہ کے ساتھ کتنا ناقابل برداشت ظلم کیا گیا مجھے ہنسانے کے لئے نہیں بلکہ رلانے کے لئے پر لطف مناظر دکھلائے گئے۔ ہاں اوس وقت دریا کی مستانہ لہریں پرکیف انداز سے جاری تھیں۔ آفتاب کی سنہری شعاعیں اوس کی متلاطم اور بیقرار سطح پر ضیا باری کر رہی تھیں۔ یا زریں شعاعیں دریا کے دامن سے اپنا گرا ہوا سونا چن رہی تھیں۔ فضائے بسیط کا سماں دلفریب ہوا کی رفتار مستانہ شفق کی سرخی بادہ ریز۔ اوس وقت میں نے چاہا کہ تیرا خیال ایسے دلکش منظر کو دیکھکر میرے لئے سامان عیش کا باعث نہو جس میں بغیر تیرے تنہائی محسوس نہ کروں لیکن آہ! میرا کمزور دل بیٹھ گیا۔ ضبط محبت کے عزم بالجزم میں نمایاں شکست ہوئی۔ میری ظاہری متانت اور سنجیدگی خاک میں مل گئی۔ مجھ سے ضبط نہو سکا۔ اپنی تنہائی اور مجبوری مجھے بیساختہ یاد آگئی یاد کے ساتھ ہی آنکھوں سے نہ تھمنے والے آنسو جاری ہو گئے دل تڑپ گیا۔ مجھے یاد آگیا کہ انھیں ایام برشکال میں اس مقام پر آکر اپنے ہاتھوں سے میرے افسردہ

دل و دماغ میں نئی روح پھونکدیتا۔ افکار زمانہ کلیتہً نیست و نابود ہو جاتے۔ تو قدرت کی گلکاریوں کی طرف مجھے متوجہ کرتا تو مناظر قدرت کا دلدادہ تھا!

دلکش مناظر قدرت کے شیدائی! تو کہاں ہے۔ تجھے کہاں تلاش کروں۔ کاش اس درد انگیز سانحہ کے وقت تو میرے پاس موجود ہوتا میرے دل ناصبور کو تسکین دیتا ——

"بگذر اے دوست تا بوقت بہار" کی ہمنوائی کرنے والے کوئی اور ہونگے۔ ان ناکام آنکھوں کو ایسے جگر خراش منظر کی تاب کہاں۔ بیدرد دنیا نے تجھے مجھ سے چھین لیا۔ لیکن تجھ ایسے مجسمۂ وفا کی یاد میرے دل سے فراموش نہیں کر سکتی۔ اور نہ اس سلسلۂ کلام کو منقطع کر سکتی ہے۔ تیری تصویر ہمیشہ پیش نظر رہیگی۔

جانے والے! تیری جدائی نے زندہ درگور کر دیا۔ مجھے ٹھنڈے دل سے مشورہ دیا جاتا ہے کہ تیری تلافی کسی اور "دوست" سے کروں۔ شاید ان ناواقفوں کو معلوم نہیں کہ ہر شخص کی زندگی میں اُسے صرف ایک ہی دوست ملتا ہے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے۔ جب کسی کے متعلق سنتا ہوں "انکا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ انکے دوستوں کو نہ پوچھو"

اس پر طرہ یہ کہ بعض حضرات خود بھی طفلانہ تفوق کے طور پر اسکا اعلان کرتے ہیں۔ اس مشورہ کو احسان سمجھوں یا ظلم۔ تجھے جدا ہوئے عرصہ ہو گیا۔ بایں ہمہ مجھے تو اب تک کوئی ایسا نہ ملا جو درد دل کا درماں کرتا اور تیری تلافی کر دیتا۔ اس وسیع صحن عالم میں مجھے تجھ سا مخلص اور باوفا نہ ملا۔ اور ملکر کیا کریگا مجھے آرزو نہیں اور نہ اسکی تمنا۔ اس داغدار دل میں نہ اب تجدید محبت کا ولولہ باقی اور نہ اس سوختہ جگر کو اقرار محبت کی تاب۔ آہ تم کیا گئے ہمیشہ کے لئے میری مسرتوں کو اپنے ہمراہ لیتے گئے۔

ذوقِ خلش بجا ہے نہ اب وہ مذاقِ عشق
دنیا بدل گئی دلِ دردآشنا کے بعد



دو رنگی غزل

از حضرت امیر خسرو دہلوی مرحوم

امیر خسرو ہندوستان کے وہ مایۂ ناز شاعر گذرے ہیں جنکی سحر طرازیوں نے ادب پرور ایرانیوں کے سر تسلیم خم کرا دیئے۔ یہہ غزل انکی غزلیات کا شاہکار کہی جانے کے قابل ہی جسنے اردو شاعری کا بیج بویا۔ اردو شاعری کیونکر پیدا ہوئی۔ اسکی ابتدائی شکل کیا تھی یہ اسی غزل میں فارسی ہندی کی عروسی دیکھنے سے پتہ چلتا ہی کہ امیر خسرو نے کس خوبی سے نقش اول بنایا ہی (ایڈیٹر)



زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں　　کہ تابِ ہجراں ندارم ایجاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ　　سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں　　کسے پڑی ہی جو جا سنائے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چو شمعِ سوزاں چو ذرہ حیراں زمہر آں مہ بگشتم آخر　　نہ نیند نیناں، نہ رنگ چینا، نہ آپ دیں، نہ بھیجیں پتیاں

بحق روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو

سپیت منکے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

انتخاب مشاعرہ انجمن بزم اہل ادب سیتاپور

(از نشاط لکھنوی)

جناب مرزا امراؤ بیگ صاحب عشق لکھنوی سابق حال سیتاپور

ہمیں مساجد ہمیں مسجود کیوں قید مکاں کرتے — یہ تھی تحصیل حاصل گر تلاش آستاں کرتے
یقیناً ترک ہستی سے در مقصود ہاتھ آتا — اگر ہم بے نشاں ہو کر تلاش بے نشاں کرتے
نہ پوچھو گھر سے کس صورت سے ہم خود دار نکلے ہیں — ہمیں اب شرم سی آتی ہے ذکر آشیاں کرتے
نہ تھی اک بوند تن میں خون کی نادار ایسے تھے — کسی کا تیر کیونکر دل میں اپنے مہماں کرتے
جناب عشق انکا آستاں ہم کو نہ جب ملتا — جبیں کو اپنی وقف سجدۂ پائے بتاں کرتے

جناب وجاہت حسین صاحب صدیقی انجام سیتاپوری

جدائی کا اگر دلچسپ قصہ ہم بیاں کرتے — یقیں ہے نیند شب کی آپ نذر داستاں کرتے
دم آتے بھی تو کیا ہم نزع میں حالت بیاں کرتے — مگر آنکھوں سے آنسو بہہ کے شرح داستاں کرتے
اثر ہوتا نہ ہوتا اک ذرا تسکین ہو جاتی — فسانہ درد دل کا آپ سنتے ہم بیاں کرتے
کئی افسانے ایسے تھے کہ جو بیچین کر دیتے — بیاں کیا ختم تک ہم تم سے اپنی داستاں کرتے
تمہارا عشق میری بیخودی کا راز کھل جاتا — مزا جب تھا کہ دیوانہ بنا کر امتحاں کرتے
سکون دل کی جو گذری ہوئی دنیا پلٹ آتی — تو ہم بھی اعتبار انقلاب آسماں کرتے

جناب حکیم آفاق حسین صاحب بیدار سیتاپوری

ہم اپنی آہ سوزاں کا اگر اونچا دھواں کرتے — تو بیدا اور زیر آسماں اک آسماں کرتے
نہ پوچھو ہمدمو کچھ خانہ بربادی کا افسانہ — جگر میں ہوک سی اٹھتی ہے ذکر آشیاں کرتے
پہنچ جاتے کبھی تو بیٹھتے اٹھتے سر منزل — اگر کچھ رہنمائی نقش پائے رفتگاں کرتے
اسیرو آؤ کچھ ہو مشغلہ رونے رلانے کا — بہت جی چاہتا ہے آج ذکر آشیاں کرتے
زمانہ بھر تو لے بیدار تھا بیدرد نظروں میں — بیاں ہم کس سے اپنے درد دل کی داستاں کرتے

جناب ولی الدین صاحب ولی سیتاپوری

یہہ کیونکر جھک کے ہم اے دل تلاشِ لامکاں کرتے
زمانے بھر کو گردش تھی قیام آخر کہاں کرتے

سمجھ ہوتی حسینوں کو تو قدر عاشقاں کرتے
دغا ہے آشنا کیونکر وفا کا امتحاں کرتے

ملی فرصت نہ ہمکو بیخودی سے عمر بھر ورنہ
زمین دل کے ہر ذرہ کو ہم اک آسماں کرتے

گیا دل بزم جاناں میں یہ غفلت صرف اپنی تھی
ہوئے تھے بدگماں جس سے اُسکو پاسباں کرتے

چلے ہیں ٹھوکریں کھاتے ولی ناواقف منزل
کوئی حد بھی ہے کب تک انتظار کارواں کرتے

جناب منظور احمد صاحب نظر۔ ملازم بندوبست سیتاپور

وہاں زخم سے پیدا زباں اے ہم زباں کرتے
خموشی میں زبانِ بے زباں سے ہم فغاں کرتے

مقدر کی یہ خوبی ہے اوسی پر گر پڑی بجلی
ارادہ جب کیا اس شاخ پر ہم آشیاں کرتے

رہے صحرا میں تھک کر آبلہ پا منزلِ غم کے
ترا کب تک تعاقب اے غبار کارواں کرتے

وہ گل گشت انکی شوخیاں بھی کیا قیامت تھیں
صبا شرما رہی ہے باغ میں اٹھکھیلیاں کرتے

جو منظور نظر تھے اے نظر ہیں دور نظروں سے
یہ ارماں ہے انھیں آنکھوں کی اپنی پتلیاں کرتے

جناب عزیز الحسن صاحب عزیز۔ طالب علم درجہ دہم راجہ اسکول سیتاپور

پس مردن جو آئے لاش پر میری تو فرمایا
تمھیں لازم نہ تھا یوں ہمکو رسوائے جہاں کرتے

نشان قبر بھی اب تو کہیں ڈھونڈھی نہیں ملتا
سوا اسکے کہاں تک آپ ہمکو بے نشاں کرتے

بوقت نزع بالیں پر ہماری تم جو آجاتے
ہم اک ہچکی میں سارا ختم اپنی داستاں کرتے

جناب محمد یحییٰ صاحب رضوی۔ نائب صدر و اصلباقی نویس کلکٹری سیتاپور

نہ کرتے تیرے در سجدہ ہم ٹھکانا تو کہاں کرتے
بیاں تجھ سے نہ کرتے حال تو کس سے بیاں کرتے

پھنسا غفلت میں کچھ ایسا بھلایا اپنی ہستی کو
جو انساں بنکے میں رہتا صفت کروبیاں کرتے

خبر کیا تھی کہ اشک غم کی تم بھی قدر کرتے ہو
یہ سمجھے تھے تو ان چشموں سے ہم دریا رواں کرتے

گلوں میں رنگ و بو کیسی ہے بلبل میں فغاں کس کی
جدا ہوتا جو اپنا راز خود دونوں بیاں کرتے

جب آئے تھے تو خود گریہ کناں تھے بزم ہستی میں
مگر جاتے ہیں خوش خوش چھوڑ کر سب کو فغاں کرتے

جناب ممتاز حسین صاحب۔ خضر سیتاپوری

گذشتہ آفتوں کو ہم کسی سے کیا بیاں کرتے
نہاں جو ہو گئے تھے داغ انھیں کیونکر عیاں کرتے

مقدر میں لکھا تھا حشر کے دن دیکھنا ان کا
اب انکو دیکھتے یا داستان غم بیاں کرتے

محبت ہم نے ان سے کی انھوں نے ہمکو تڑپایا
بس اتنی بات تھی اسکو کسی سے کیا بیاں کرتے

جنھیں راحت نہ ہو حاصل انھیں تکلیف کا کیا ڈر
بہار آتی تو ہم اندیشۂ فصل خزاں کرتے

اگر معلوم ہو جاتا کہ وہ اپنے نہیں ہوں گے
تو اے خضر عمر اپنی الفت میں کیوں رائیگاں کرتے

جناب پنڈت رتن نرائن صاحب۔ عرش لکھنوی سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس سیتاپور

تڑپتے لوٹتے کچھ ہم نہ فریاد و فغاں کرتے
اک آہ سرد کے پردے میں راز دل عیاں کرتے

مرے قلب و جگر کی بے بسی پر اک جہاں کرتا
یہ ناکام محبت مل کے جب آہ و فغاں کرتے

نہ جانے کون سے شکوے تھے جو پیش جہاں کرتے
وہ آئیں سامنے میرے ذرا مجھ سے بیاں کرتے

سمجھتے گر نہ آئیگا سر بازار وہ یوسف
ہم اپنی خاک کو کیوں نذر گرد کارواں کرتے

نہاں ہیں خاک کے پردے میں کیا کیا حسن کے جلوے
کہاں قدرت گلوں میں ہے کہ وہ انکو عیاں کرتے

تعلی کی نہ لو اے عرش بس خاموش ہو جاؤ
رموز ہستی موہوم کو تم کیا بیاں کرتے

جناب اقبال بہادر صاحب۔ طالب سیتاپوری

نگاہوں کو نگاہوں سے لڑا کر امتحاں کرتے
وہ دلکو اس ادا سے نیم بسمل نیم جاں کرتے

چلو اچھا ہوا الفت میں چشم و دل کو رو بیٹھے
کہ فاش اک دن ڈھکا پردہ وہی بےخانماں کرتے

دیئے ہوتے ہمیں بھی دیدۂ دل حق نے بہتر کے
تو ہم بھی بے دھڑک نظارۂ حسن بتاں کرتے

وہی شاہد وہی ثالث وہی حاضر وہی ناظر
کسی کو کس لئے ہم انکے اپنے درمیاں کرتے

کھلے ہیں سبزۂ و گلہائے خود رو ہو کے چمن ہر سو
کسی دن آپ بھی سیر مزار بیکساں کرتے

بیاں ہوتا جو لب سے عیاں وہ آنکھ سے ہوتا
چھپاتے کس سے دل کا راز کسکو راز داں کرتے

جناب سید ابن حسن صاحب نشاط۔ لکھنوی

یہ دل پتھر نہیں ہے جب تو کیوں ضبط فغاں کرتے
مذاق عشق کو رسوا کہاں تک مہرباں کرتے

قفس میں تھے نظر کیا خاک سوئے آشیاں کرتے
رہا ہوتے تو ٹوٹے بازوؤں کا امتحاں کرتے

ستارے جھلملائے چاند ڈوبا شب ہوئی آخر
اُٹھے ہیں چارہ گر بالیں سے کچھ سرگوشیاں کرتے

سمجھ کر خاک کے ذرّے جنھیں پامال کر ڈالا
کوئی سنتا تو یہ افسانۂ ہستی بیاں کرتے

تبسم بجلیوں کا قید میں دیکھا نہیں جاتا
جو بس ہوتا تو خود برباد اپنا آشیاں کرتے

بس اب پردہ کو رہنے دیجئے معلوم ہی سب کچھ
سنا ہی حال کچھ موسیٰ کو رُک رُک کر بیاں کرتے

کھنچا جاتا تھا دل پہلو سے اور قابو نہ تھا کوئی
تمھیں تم سامنے جب تھے تو پھر کس پر گماں کرتے

جناب مولوی عبدالمجید صاحب ۔ حمید بنارسی

نہ قصہ مختصر کرتے نہ بند اپنی زباں کرتے
کسی کی داستاں ہوتی وہ سنتے ہم بیاں کرتے

ہمارے ٹکڑے کر کے تم ہمارا امتحاں کرتے
بھلا ہم اور تم سے امتیاز جسم و جاں کرتے

اوسی کے سر رہا سہرہ ہماری پردہ پوشی کا
جنوں ہوتا نہ ہم دامن کی اپنے دھجیاں کرتے

جو دنیا کے علائق سے ہمیں چھٹکارا مل جاتا
تو ہم اصلی وطن جانے کی اب تیاریاں کرتے

حمید اب کام آخر ہے حمید اب عمر آخر ہے ۔
خدا کا نام لیتے اب نہ تم ذکر بتاں کرتے

چار ضروری کتابیں

تذکرۃ الصحابیات

رسول اسلام کے ازواج و بنات و قرابتدار عورتوں کے سوانح حیات بالتفصیل اور مشرح لکھے گئے ہیں۔ قابل مصنف نے اپنی طرز تحریر سے اپنی قابلیت کا پورا ثبوت دیا ہے۔ یہ کتاب ہر شریف گھرانے کی عورتوں کے لئے بیحد ضرور رکھنا ہے۔ اسکا حجم ۲۰۰ صفحہ کا ہے سائز ۲۰×۲۶/۸ ہے قیمت صرف عہ علاوہ محصولڈاک۔

سید گل

مصنفہ حضرت لسان الشعراء مولانا شاعر لکھنوی۔ یہ بارہ نظموں کا بے نظیر مجموعہ ہے جسمیں کہ ہر نظم اردو کے ادب میں ایک گراں بہا اضافہ سمجھی جاسکتی ہے۔ اسکی ایک نظم دوشیزہ کہسار نظارہ کے جولائی اور اگست نمبر میں شایع ہوچکی ہے اسکے دیکھنے کے بعد ناظرین کافی اندازہ کرسکتے ہیں قیمت صرف ۸ر

احیاء المیت

علامہ جلال الدین سیوطی کی بے نظیر مجموعہ حدیث جسکا صحیح ترجمہ ہم نے شایع کیا ہے کچھ دنوں پہلے یہ کتاب نایاب تھی قیمت صرف ۴ر

خصائص مرتضوی

حضرت علی علیہ السلام کے حالات کا بہترین مجموعہ کون ایسا شخص ہوگا جو اسکے مصنف امام نسائی سے ناواقف ہے۔ یہ کتاب بھی کمیاب تھی اسکو ہم نے صحیح ترجمہ اردو میں شایع کیا ہے قیمت ۸ر

المشتہر سید ابن حسین بازار ملا ظریف لاہور سٹیٹ

حسن کیونکر قائم رہ سکتا ہے؟

صرف غازۂ حسن اور دلیسی کریم کے استعمال سے



غازۂ حسن منہ دھونے کا بہترین پوڈر چہرے کو سرخ و سفید کرتا ہے جلد کو ملائم کرتا ہے۔ جس نے بھی ایک مرتبہ منگایا وہ ہمیشہ کے لئے غازۂ حسن کا خریدار ہو گیا۔ آپ بھی منگا کر دیکھئے صرف آٹھ آنہ کا ایک ڈبہ ملتا ہے جو ایک ماہ استعمال کیا جاتا ہے ایک مرتبہ آٹھ آنہ کھو دیجئے یا تو آپ کو ہماری دروغگوئی ظاہر ہو جائے گی ورنہ آپ ہمیشہ خریدار ہو جائینگے۔

دلیسی کریم آجکل جاڑوں میں چہرے کے تمام مہاسے دور کرتی ہے۔ آجکل جسم کی کھال پھٹ پھٹ کر اکثر خون نکل آتا ہے اسکے لئے اکسیر ہے خوشبو اتنی تیز ہے جسکی انتہا نہیں۔ آپ ولایتی کریم سے رنگ، خوشبو، فوائد ہر طرح سے ملا کر دیکھ سکتے ہیں قیمت فی شیشی صرف آٹھ آنے علاوہ محصول

المشتہر

شمسی اینڈ برادرس لال مسجد رامپور اسٹیٹ

فائدہ نہو تو قیمت واپس

معجون مقوی - جریان، احتلام، رقت، سرعت، کا تیر بہدف علاج قوت باہ کی بینظیر دوا۔ اس معجون مقوی میں قیمتی اجزار شامل ہیں مثلاً مروارید سفید، ورق طلار و نقرہ، یاقوت سرخ وغیرہ وغیرہ اگر آپ کو ہم پر اعتبار نہو تو ہم آپکے سامنے معجون بناکر تیار کردیں قیمت ۳۰ خوراک عـہ علاوہ محصولڈاک ۱۵ خوراک ؎ علاوہ محصولڈاک۔

سفوف جریان یہ بھی ہماری بینظیر کثیر الفوائد دوا ہے۔ ہزاروں مریضوں پر تجربہ کیا جاچکا ہے اسکا اثر تین دن کے استعمال سے فوری ظاہر ہوجاتا ہے۔ پرانے سے پرانا جریان چند دن کے استعمال سے نیست و نابود ہوجاتا ہے قیمت فی شیشی جو بالکل اچھا کردینے کے لیے کافی ہے صرف للعہ علاوہ محصولڈاک

بینظیر طلاء - کجی، لاغری، سستی، رگوں کا نیلا پن اس طلار کے فوری استعمال سے دور ہوجاتا ہے۔ ہر موسم میں اسکا استعمال ہوسکتا ہے ۳۲ سال کا آزمودہ ہے۔ ہزار ہا مریضوں پر تجربہ کیا جاچکا ہے ذیل میں اسکی چند دوائیں درج کی جاتی ہیں۔

مار سیاہ (۱۲ عدد) مغز گرگٹ (۲ تولہ) مغز کنجشک (۳ تولہ) مغز خرگوش (۲ مار) مغز خشخاش (۲ مار) مستی فیل (۱ تولہ) مستی شتر (۱ تولہ) مستی مینڈک (۱ تولہ) مستی سانڈہ (۱ تولہ) مغز کبوتر صحرائی (۱۰ تولہ) وغیرہ وغیرہ ابھی بہت سی ایسی دوائیں بلحاظ طوالت درج نہیں کی گئیں جنمیں کی ایک ایک دوا آٹھ آٹھ روپیہ میں حاصل ہوتی ہے یہ نسخہ مہینوں کی محنت میں تیار ہوتا ہے اگر اسمیں کی کسی دوا کو کوئی شخص یہ ثابت کردے کہ وہ اس طلار میں شامل نہیں ہے تو اس کو سو روپیہ انعام دیا جائیگا قیمت فی شیشی جسمیں ڈیڑھ ماشہ طلار ہوتا ہے اور جو ایک مریض کیلئے کافی ہے مبلغ تیس روپیہ علاوہ محصولڈاک وغیرہ

طلاء اکسیر یہ طلار اسم بامسمیٰ ہے لگاتے ہی اپنا اثر کرتا ہے۔ بچپن کی غلط کاریوں کے لئے یہ اکسیر ہے قیمت فی شیشی جسمیں تولہ بھر ہوتا ہے للعہ علاوہ محصولڈاک۔

نوٹ:- آجکل اشتہاری دوا بازوں نے جو ملک میں غلط فہمی پیدا کررکھی وہ پوشیدہ نہیں اسلئے اگر آپ ہماری دوائیں منگاتے ہوئے ڈرتے ہیں تو یا تو آپ خود بغرض علاج ہمارے پاس تشریف لائیے یا ہم کو اپنے پاس بلائیے۔ فیس وغیرہ بذریعۂ خط و کتابت طے کیجئے۔ اسمیں کی ہر دوا (ہم کہنے پر تیار ہیں) کہ اگر فائدہ نہ کرے تو حلفیہ بیان پر قیمت واپس کردیجائیگی۔

المشتہر حکیم محمد سید ہاشم جوہری محلہ لکھنؤ